بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً

عکسِ دروں

سلسلۂ مضامین	عنوانِ مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
صدائے حسن	شعائر اسلام کی توہین اور اُمتِ مسلمہ کی مجرمانہ خاموشی	اداریہ	3
اسلامی زندگی	تربیت اولاد۔۔۔چند گزارشات	مفتی ابوسنابل	6
	ایمان واسلام	مولانا عیدی امین	10
	سلام	مولانا عنایت شاہ ترناب	15
تحقیقی مضامین	قمری ماہ وسال سے متعلق چند بنیادی باتیں	مولانا ابوحمران حقانی	20
	مقامِ بخاریؒ (قسط دوم)	علامہ شمس الحق افغانی	29
	نبی کریم ﷺ بطور سپہ سالار	مفتی محمد فہیم اللہ	36
بیانات جمعہ	جشن آزادی اور ہماری ذمہ داری	مولانا غلام اللہ صاحب	43
	شان سیدنا عمر فاروقؓ	مولانا غلام اللہ صاحب	48
دارالافتاء	سادات کو زکوٰۃ دینا	مفتی حمید اللہ جان	54

زرِسالانہ اندرون ملک:300روپے۔زرِسالانہ بیرون ملک:20ڈالر

ای میل ایڈریس:Muftifahim@gmail.com

atifshah336@gmail.com

ویب ایڈریس:www.alhasan.org

اکاؤنٹ نمبر:میزان بینک: 8101.0100843213

MCB: 0284.1002564

﴿صدائے حسن﴾

شعائرِ اسلام کی توہین اور اُمتِ مسلمہ کی مجرمانہ خاموشی

مولانا عدنان حقانی

پوری دنیا میں جتنی زیادہ منافقت آزادئ اظہارِ رائے (freedom of speech) کے نام پر ہوتی ہے اور کسی چیز کے نام پر نہیں ہوتی اور ہر دفعہ ان کی منافقت کا نشانہ ہوتا ہے صرف اور صرف اسلام۔ مثلاً گذشتہ دنوں سویڈن کے دارالحکومت سٹاک ہوم میں سلوان مومیکا (salwan momika) نامی ایک عراقی ملعون نے 28 / جون کو عیدالاضحیٰ کے دن ایک بڑے جمِ غفیر کے سامنے قرآن پاک کے نسخے کو جلایا اور اس کی توہین کی۔ اس توہین کے نتیجے میں عراق میں موجود سویڈن کے سفارت خانے کا گھیراؤ کیا گیا اور اس کو آگ لگا دی گئی اور مظاہرین نے حکومت سے سویڈن کے سفیر کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کے ردِ عمل میں حال ہی میں دوبارہ سے 20 جولائی 2023ء کو اسی عراقی ملعون نے سویڈن میں موجود عراقی سفارت خانہ کے سامنے سویڈش انتظامیہ کی اجازت سے قرآن پاک کی توہین کی اور ان سب کے لیے سہارا لیا گیا freedom of speech جیسے گھٹیے قانون کا۔ حالانکہ اسی سویڈن کا قانون کہتا ہے کہ سویڈن کے اندر کوئی بھی شخص شاہی خاندان یا اس کے کسی فرد کی توہین یا ان کے خلاف کسی بھی قسم کے توہین آمیز جملے نہیں بول سکتا اور اگر کوئی اس طرح کے جرم میں ملوث پایا گیا تو وہ چار سال کے لیے جیل جائے گا۔ اگر دوبارہ اس طرح کے کسی جرم کا مرتکب ہوگا تو اس کو چھ سال کے لیے جیل کے سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے گا۔ یہاں پر ان کے freedom of speech کا قانون لولا لنگڑا ہو جاتا ہے، لیکن جہاں پر اسلام کی باری آتی ہے، جہاں پر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی باری آتی ہے؛ وہاں پر ان کی حکومت، ان کی عدالتیں freedom of speech کا سہارا لے کر بار بار عراقی شہری کو قرآنِ مقدس کی توہین کرنے کی اجازت دے رہی ہے۔

اُنہوں نے تو جو کرنا تھا کر لیا، لیکن جن لوگوں کی مقدس کتاب کی توہین کی گئی اور جن کی دینی زندگی

کے سرچشمہ اور راہنما اُصول اور قانون کی بے حرمتی کی گئی، ان کا رویہ بتاتا ہے کہ وہ اپنی کتابِ مقدس اور شعائر اسلام سے کتنے مخلص ہیں ۔مراکش ،عراق اور افغانستان کے علاوہ پورے عالمِ اسلام بشمول سعودی عرب اور اکلوتے ایٹمی اسلامی ملک پاکستان کو اس واقعہ پر جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔مراکش جیسے چھوٹے ملک نے دینی حمیت کا ثبوت دیتے ہوئے فوری طور پر سویڈن سے اپنے سفیر کو غیر معینہ مدت کے لیے واپس بلالیا۔عراق جو تقریباً دو دہائیوں سے ایک جنگ زدہ اور خانہ جنگی کا شکار ملک ہے، نے انتہائی جرأت مندی اور دینی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے دوبارہ گستاخی کے نتیجے میں سویڈن کے سفیر کو ملک بدر کرنے اور اپنے ناظم الامور کو واپس بلانے کا فیصلہ کرلیا۔اس کے ساتھ ساتھ عراق میں بہت بڑے پیمانے پر کام کرنے والی سویڈش کمپنی ایریکسن کو بھی کام سے روک دیا۔اسی طرح افغانستان نے بھی عیدالاضحیٰ کی گستاخی کے بعد افغانستان میں کام کرنے والی سویڈش کمپنی S.A.C کو کام کرنے سے روک دیا۔ان کے علاوہ کسی ایک اسلامی ملک میں بھی یہ جرأت نہیں کہ وہ اس دلخراش واقعہ پر سویڈن کے خلاف کچھ کڑوے الفاظ بول کر سویڈن کو ناراض کرسکے۔

یہاں پر مسلم ممالک کی نمائندہ تنظیم او۔آئی ۔سی (Organisation of Islamic Coopreation) کا تذکرہ کرنا بے جانہ ہوگا، جو اس قسم کے واقعات کی روک تھام اور اُمت مسلمہ کو متحد رکھنے کے لیے قیام عمل میں لایا گیا تھا۔اس تنظیم کی طرف سے نہ صرف اس واقعہ پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے، بلکہ اس سے پیشتر جتنے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس طرح کے واقعات سامنے آئے، ان کے نقصانات کا ازالہ کرنے اور اس جیسے واقعات کی روک تھام میں ناکام نظر آئی۔

کاش! نیٹو کی طرح مسلمان ممالک کا بھی کوئی فعال عسکری اتحاد ہوتا تو یورپ کے یہ شدت پسند اس طرح کا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے اپنے انجام کو سوچتے۔

دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہمارے ملک پاکستان کے وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف کی طرف سے بھی عیدالاضحیٰ کی گستاخی کے بعد ہمیشہ کی طرح ایک مذمتی بیان جاری کیا گیا اور اس کے علاوہ ٹھوس اقدام اُٹھانے کی ان کو بھی جرأت نہیں ہوئی۔PDM کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے میاں شہباز شریف سمیت تمام مسلم ممالک سے سویڈن کے سفیر کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا اور 23 جولائی کو اتوار کے دن کراچی پریس کلب سے اس گستاخی کے خلاف ملک گیر احتجاج شروع کیا۔اس کے علاوہ ملک کی کسی بھی سیاسی

طاقتور شخصیت نے اس طرح کا جرأت مندانہ مؤقف نہیں اپنایا، لیکن اس سے پہلے بھی کئی دفعہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان مظاہروں اور مذمتی بیانات کا چنداں فائدہ نہیں ہوا اور آئے روز یورپ کے انتہا پسندوں کی طرف سے شعائر اسلام کی گستاخی سامنے آرہی ہے۔

سابقہ تمام واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام دنیا کے مسلم حکمران حکومت اور اقتدار کے نشے سے نکل کر علاقائی، لسانی اور نسلی تفریق کو پس پشت ڈال کر متحد ہو جائیں اور دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والے مسلمانوں کے دینی اور جانی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں، تاکہ آئندہ ان جیسے تمام واقعات کا بھرپور طریقے سے سدباب کیا جاسکے اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ان حکمرانوں سمیت تمام دنیا کے مسلمان اس سے زیادہ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائیں گے۔

خدارا! ہوش کے ناخن لیں! اور دنیا میں دین اسلام، مسلمانوں اور شعائر اسلام کی توہین کے روک تھام میں اپنا کردار ادا کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمام اُمت مسلمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق بن جائے۔

﴿ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ ﴿الفرقان: 30﴾

روح اور نفس میں فرق؟

بعض علما کے نزدیک روح اور نفس ایک ہی شے ہے، مگر محققین علما کے نزدیک روح اور نفس دو علیحدہ علیحدہ شے ہے۔

استاذ ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں:

''اخلاقِ حمیدہ کے معدن اور منبع کا نام روح ہے اور اخلاقِ ذمیمہ کے معدن اور سرچشمہ کا نام نفس ہے، مگر جسم لطیف ہونے میں دونوں مشترک ہیں، جیسے ملائکہ اور شیاطین جسمِ لطیف ہونے میں مشترک ہیں، مگر ملائکہ نورانی اور شیاطین ناری ہیں۔ فرشتے نور سے پیدا کیے گیے اور شیاطین نار (آگ) سے پیدا کیے گیے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں صراحتاً مذکور ہے:

ان الله خلق اٰدم وجعل فيه نفسا وروحا فمن الروح عفافه وفهمه وحلمه وسخائه ووفائه ومن النفس شهوته وطيشه وسفهه وغضبه ونحو هذا۔۔۔ (سیرت مصطفیٰ از مولانا محمد ادریس کاندھلوی، جلد اول)

﴿اسلامی زندگی﴾

تربیت اولاد..... چند گزارشات

مفتی ابوسنابل (سید اقبال شاہ)

معمول کے مطابق مدرسے سے واپسی کرتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوا، جس میں پہلے سے چند جوان اور کچھ عمر رسیدہ حضرات بیٹھے ہوئے تھے، ایک بابا جی کے پاس والی سیٹ پر ہمیں جگہ ملی۔ سلام کر کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ بابا جی نے کچھ ایسے انداز میں بات شروع کی کہ ہمیں محسوس ہوا کہ گفتگو گزشتہ سے پیوستہ ہے، معلوم نہیں کہ بابا جی کی باتیں کب سے جاری تھیں، لیکن سٹاپ پر گاڑی کے رکنے اور ہمارے سوار ہونے نے ان کے لیے ایک وقفہ کا کام ضرور دیا۔

بابا جی: اللہ تعالیٰ کسی کو نارینہ اولاد نہ دے، ہماری یہ تمنا اور خواہش تھی کہ بیٹا پیدا ہو، مگر یہ تمنا ہمیں لے ڈوبی۔ اللہ پاک اس کو رسوا کرے، مجھے تو ذلیل کر کے رکھ دیا ہے، حالانکہ اس کی پیدائش پر ختنہ پروگرام (عقیقہ کی تقریب) کے لیے قرض لیا تھا۔

ہمیں اندازہ ہوا کہ بابا جی اپنے بیٹے سے نالاں ہیں، ہمت کر کے بابا جی سے پوچھ ہی لیا، بابا جی! آپ کا بیٹا کام کیا کرتا ہے؟ کہنے لگے کہ فارغ ہی پھرتا رہتا ہے، میرے سفید ریش کا اس کو ذرا بھی خیال نہیں، اس عمر میں جانوروں کو پال رہا ہوں اور سارا کام کاشت کاری کا کر رہا ہوں۔ بیٹے کی تعلیم کا پوچھا تو کہنے لگا کہ حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ پڑھائی ہماری مقدر میں کہاں۔ میں نے کہا: پاس مسجد یا مدرسہ تو ہوگا، کچھ قرآن پڑھنے اور سیکھنے کے لیے بھجوا دیتے۔

ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بابا جی نے کہا: اس معاملے میں تو باپ بیٹے دونوں بدقسمت ہیں، وہ نالائق تو پڑھتا ہی نہ تھا اور نہ ہم نے کوشش کی، ورنہ یہ چیزیں تو مفت ہیں اور ہر جگہ بسہولت میسر بھی ہیں۔

اس سے پہلے کہ بابا جی دوبارہ بددُعا اور سخت کلمات کا سلسلہ شروع کرتے، ہمارے اترنے کی جگہ آئی، سلام کر کے ہم گاڑی سے تو اترے، مگر بابا جی کی باتوں سے بہت کچھ ذہن و خیالات پر سوار کر کے

اُترائے۔

معلوم نہیں روزانہ کتنے ایسے بوڑھے والدین اپنی اولاد کو کوس رہے ہونگے، بد دعا دے رہے ہونگے۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی نوبت کیوں آتی ہے اور اس کے اسباب میں کیا کوئی ایسا سبب تو نہیں جس کے مسبب ہم خود ہوں؟ جی ہاں! جی ہاں اس کی ایک بڑی وجہ اولاد کی دینی اور اسلامی تربیت کا فقدان ہے۔

جس طرح اولاد پر لازم ہے کہ والدین کا ادب، احترام اور خدمت کرے، اسی طرح والدین کے ذمہ ہے کہ اولاد کو بہترین دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت دیں۔ بچے کی پہلی تربیت گاہ جہاں سے اس کی شخصیت کی ابتدائی تشکیل ہوتی ہے، وہ گھریلو زندگی ہے۔

والدین کی توجہ اور تربیت ہی سے اخلاقی قدروں کی محبت اولاد کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور یہ سب چیزیں والدین کی ذمہ داری اور فرائض میں داخل ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے ارشاد فرمایا:

" اَدب ابنك فانك مسؤل عن ولد ك، ماذا ادبته؟ وماذا علمتهٗ؟ و انه مسؤل عن برك و طواعيته لك. (شعب الايمان للبيهقى، حديث نمبر:5928)

ترجمہ: اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کرو، کیونکہ آپ سے اپنی اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ آپ نے اس کی کیسے تربیت کی ہے اور اس کو کیسی تعلیم دی ہے؟ اور اولاد سے آپ کے ساتھ بھلائی اور فرماں برداری کے بارے میں سوال ہوگا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اولاد پر والدین کے حقوق سے پہلے، والدین کے ذمہ یہ فرض اور لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اولاد کی صحیح دینی تربیت کریں، یہی وجہ ہے کہ بچے کو بالغ ہونے سے پہلے پہلے نماز کی تاکید اور اس میں سستی پر حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے مارنے کا حکم حدیث سے ثابت ہے، تاکہ وہ پہلے سے نماز پڑھنا سیکھ لے اور نماز کو صحیح طریقے سے اہتمام و پابندی کا عادی اور خوگر ہوجائے، چنانچہ حضرت سبرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

”مروا الصبی بالصلوۃ؛ اذا بلغ سبع سنین واذا بلغ عشر سنین فاضربوہ علیھا“.

(ابوداؤد،حدیث نمبر:714)

ترجمہ:جب بچہ سات سال کا ہوجائے تو اس کو نماز کا حکم دو اور جب دس سال کا ہوجائے تو نماز چھوڑنے پر اسے مارو۔

اولاد کا نافرمان بن کر دردسر بن جانا، گناہوں پر بے باک ہونا اور والدین کی تعظیم وخدمت میں کوتاہی کرنا؛اس بات کا لازمی نتیجہ ہے کہ والدین نے بچوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہوتی ہے۔

چنانچہ تنبیہ الغافلین میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک شخص اپنا بیٹا لے کر حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ یہ میرا بیٹا ہے، جو میری نافرمانی کرتا ہے۔حضرت عمرؓ نے اس لڑکے سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تجھے اللہ کا خوف نہیں کہ والد کی حق تلفی کرتا ہے۔لڑکا کہنے لگا کہ امیر المؤمنین! جلدی نہ کیجیے گا، آپ ذرا یہ بتلا دیجیے کہ کیا اولاد کا بھی باپ پر کوئی حق ہوتا ہے؟ فرمایا: کیوں نہیں، اس کا حق یہ ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے، قرآن پاک کی تعلیم دلائے۔(اسلامی تعلیمات کے ذریعے اس کی اچھی تربیت کرے)۔لڑکا کہنے لگا: امیر المؤمنین! یہ میرا باپ ہے، اس نے میرا نام رکھا ہے، جعل (جیم اور عین کے ضمہ کے ساتھ جس کا معنی ہے گندگی کا کیڑا) اور مجھے قرآن پاک کی ایک آیت بھی نہیں سکھائی۔یہ سن کر حضرت عمرؓ لڑکے کے باپ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

”تقول ابنی یعقنی، وانت عققته قبل ان یعقك، قم عنی“.

ترجمہ:تو کہتا ہے کہ میرے بیٹے نے نافرمانی کی ہے، حالانکہ تم نے اس سے پہلے بیٹے کی نافرمانی کی ہے، اٹھ جاؤ یہاں سے۔

بچوں کی اخلاقی تربیت اور اسلامی تہذیب شروع ہی سے اپنے باپ کی توجہ، شفقت اور انتظام سے ممکن ہے، کیونکہ ابتدا ہی سے مستقبل کی تعمیر کی بنیاد بننا شروع ہوتی ہے، اب یہ بنیاد جیسی پڑے گی، تعمیر اس کے مطابق ہوگی، کیا خوب کہا گیا ہے کہ ع

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ بچوں کی ابتدائی عمر سے جیسی تربیت ہو، وہ ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی

ہےاوراس عمر میں تمام تر ذمہ داری والدین یا دیگر سرپرستوں کی ہوتی ہےاور یہی سے غفلت اور لاپرواہی اولاد کو جہالت اور بداخلاقیوں کی اَتاہ گہرائیوں میں پھینک دیتی ہے۔

موجودہ زمانے میں بڑے دیندار اور تعلیم یافتہ طبقے بھی اولاد کی دینی تربیت میں کوتاہی برتتے ہیں، ایک طرف اولاد کی جسمانی اور مادی زندگی بہتر بنانے کے لئے ہر عام وخاص دن رات ایک کر کے محنت کر رہے ہیں، دنیا کی ہوس اور مال کے لالچ نے ہر ایک کو قید کر رکھا ہے، جبکہ دوسری طرف اولاد کی روحانی تربیت اور آخرت کی زندگانی سے بالکل غافل اور عدم توجہی کے شکار ہیں، حالانکہ جہاں اولاد کی صحت، خوراک، پوشاک دنیاوی تعلیم اور دیگر ضروریات کا انتظام وخیال کرنا چاہیے، وہاں اولاد کی روحانی تربیت اور اسلامی آداب و اخلاق کا خیال رکھنا اس سے بھی بدرجہا ضروری ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ بڑے مالدار اور صاحب اقتدار لوگ بھی اپنی اولاد کی دینی نگہداشت اور اسلامی تربیت سے غافل نہیں ہوتے تھے، چنانچہ خلیفہ ہارون الرشیدؒ کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے (مامون الرشید) کو علم اور اسلامی اخلاق وآداب سیکھنے کے لیے امام اصمعیؒ (جو کہ ایک مولوی صاحب تھے) کے سپرد کر دیا تھا۔ایک دن خلیفہ ہارون الرشیدؒ وہاں جا پہنچے، دیکھا کہ امام اصمعیؒ وضو کرتے ہوئے اپنے پاؤں دھو رہے ہیں اور شہزادہ پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے، ہارون الرشیدؒ نے یہ منظر دیکھا تو برہم ہو کر کہا: میں نے اس کو آپ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ آپ اس کو ادب سکھائیں، آپ نے شہزادے کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے آپ کا پاؤں دھوئے۔

خلاصہ یہ کہ والدین اپنی اولاد کے بارے میں تمام ان حقوق کا خیال رکھیں، جن کو اللہ پاک نے والدین کے ذمہ لازمی قرار دیا ہے، اولاد کی ذمہ داریوں کا احساس اور ان کے حقوق کی ادائیگی آخرت کی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی راحت، خوشی اور اطمینان کا سامان ہے۔

﴿اسلامی زندگی﴾

ایمان واسلام

مولانا عیدی امین صاحب

ع

قہاری وغفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ایمان اقرار وعمل کا نام ہے۔ ربانیت یا ایمان اسلامی تربیت کا سب سے اہم عنصر ہے۔ یہ سب سے اہم، زیادہ لائقِ توجہ اور دوررس اثرات کا حامل ہے، اس لیے تربیت وتزکیہ کا اولین مقصد ایک مومن کی تعمیر ہے۔

اسلام میں ایمان محض زبانی دعوے کا نام نہیں ہے۔ کسی شخص کا زبان سے یہ اعلان کر دینا کہ وہ مومن ہے، اسے مومن نہیں بنا دیتا، بلکہ یہ ایک ایسی روحانی واخلاقی حقیقت ہے، جو انسان کے دل ودماغ کی گہرائیوں تک اپنا اثر ونفوذ رکھتی ہے، اس کی شعاعیں جذبات تک پہنچتی ہیں تو ان میں ہلچل مچا دیتی ہے اور جب عزم وارادہ پر اس کی کرنیں پڑتی ہیں تو ان میں حرکت وعمل جاگ اُٹھتا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"ماوقرفی القلب وصدّقه العمل".

ترجمہ: ایمان وہ ہے جو دل میں سرایت کر جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إنّما المؤمنون الّذين امنوا بالله ورسوله ثمّ لم يرتابوا وجهدوا باموالهم وأنفسهم في سبيل الله﴾ (الحجرات:15)

ترجمہ: حقیقت میں تو مومن وہ ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر اُنہوں نے کوئی شک نہیں کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

متکلمین اور فلاسفہ کی ذہنی معرفت کو ایمان نہیں کہا جاسکتا، نہ ہی اربابِ تصوف کی روحانی لذت یابی کو ایمان کا نام دیا جاسکتا ہے اور نہ مجردِ سلوک وعبادت کو ایمان کا درجہ دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ زاہدوں کا شیوہ

ہے۔ایمان ان تمام چیزوں کا مجموعہ ہے، جوافراط وتفریط کے نقائص سے محفوظ ہے،جس کے پیش نظر اس سرزمین پرحق وانصاف کی آبادکاری، خیروصلاح کی بڑھوتری اوررشدوہدایت کی طرف انسان کی رہنمائی ہوتی ہے۔

چنانچہ صحابہ کرامؓ،تابعینِ عظام اورسلف صالحین کے حالات پڑھ کرمعلوم ہوتا ہے کہ ان کاایمان ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگیا تھا۔قلب کے اعتقاداورزبان کے اقرار کے ساتھ ان کے اعضاوجوارح بھی اس کی تائید کرتے تھے۔ان کی پوری زندگی پرایمان کی گہری چھاپ تھی۔مسجدوں،مدرسوں،گھروں اورمعاشرے میں،خلوت وجلوت میں، شب وروز کی مصروفیات میں،آخرت کے کاموں اورخالص دنیاوی کاروبار میں؛ غرض ہرجگہ ان کے ایمان کی جھلک موجودتھی۔اسی پھیلاؤ اور گہرائی کی وجہ سے ان کے ایمان کاایک منفرد اورممتاز مقام تھا۔ایمان ایک شعلہ ہے جودلوں کودہکادیتاہے،ایک آندھی ہے جوخس وخشاک کواُڑالے جاتا ہےاورایک نورضوفشاں ہے جوبرگ وبارِباطل کوبھسم کردینے والی آگ ہے۔

ایمان کی تابناکی دلِ زندہ پر منحصر ھے :

اس ایمان کی تربیت کادارومدار اس دلِ زندہ پر ہے، جواللہ سے مضبوط تعلق رکھتا ہو۔اس سے ملاقات اورحساب کتاب پرکامل یقین ہو۔اس کی رحمتوں کاطلبگاراوراس کی سزاؤں سے خائف ہو۔درحقیقت انسان اس کے مادی وجود،اس کے اعضاوجوارح اور ہڈیوں کانام نہیں ہے، بلکہ اس ایمان لطیف کانام ہے، جواس مادی وجودکومتحرک کرتی رہتی ہے،اس کوحکم دیتی اورروکتی ہے۔وہ گوشت کاایک ٹکڑاہے،اگروہ درست رہےتوپوراجسم درست رہتاہےاوراگراس میں کوئی خرابی آجائےتوپوراجسم فسادکاشکارہوجاتاہےاوریہ ٹکڑادل یافوادیاجس نام سے بھی آپ چاہیں پکارلیجیے۔یہی وہ باشعورحصہ ہے جوانسان کوزندگی کی حقیقتوں سے جوڑتا ہےاوراسے عالمِ وجود کے اسرارورموز سے واقف کرتاہے۔اسے عالمِ ہست وبود سے آسمان کی طرف لے جاتاہے۔کائنات سےاس کے خالق کی طرف منتقل کرتاہےاورعالمِ فناسےخلوت تک پہنچاتاہے۔یہی دلِ زندہ تجلّیات ربانی کامشاہدہ کرتاہے۔یہی چیزاللہ کی نگاہ میں قابلِ اعتماداورقابلِ توجہ ہے۔مشہورحدیث ہے:

"إن اللہ لاینظر إلیٰ صورکم وأموالکم ولٰکن ینظر إلیٰ قلوبکم وأعمالکم".(سنن ابن ماجه،حدیث نمبر:4143)

ترجمہ:اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کونہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اوراعمال کودیکھتا ہے۔

سورۃ شعراء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ﴾(88)﴿اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ﴾(89)

ترجمہ: جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے حاضر ہو۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے:

اگر دل میں ایمان کی انگیٹھی نہ دہک رہی ہو، یقین کے شعلے نہ بھڑک رہے ہوں تو وہ دل، دلِ مردہ ہے، جس میں زندگی کی رمق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی، جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے، اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ (انعام:22)

سورۃ حدید میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ان الفاظ میں جھنجھوڑا:

﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ﴾(الحدید:16)

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں، جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گذر گئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ اپنی دعاؤں میں غیر نافع اور نہ پگھلنے والے دل سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

درحقیقت اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے، جو سنگ دلی کو رقت و نرم دلی سے، زندگی کے جامِ تند و تلخ کو شیرینی

وحلاوت سے، مشکلات ومصائب کو وصالِ یار کی لذتوں اور فی سبیل اللہ کے سرور سے بدل دیتی ہے۔

انسانی جسم کی طرح صالح دل کو بھی تین چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے:

(۱) مکمل حفاظت (۲) روحانی غذا (۳) بیماریوں سے بچانے کے لیے علاج

مکمل حفاظت:

سب سے پہلے جس چیز سے قلبِ سلیم کو بچانا ضروری ہے، وہ دنیا کی بے جا محبت ہے۔ یہی تمام برائیوں کی جڑ اور فتنہ وفساد کا سرچشمہ ہے۔ دولت کی بے جا ہوس، اقتدار کی ناجائز بھوک اور کرسیوں کی بڑھتی ہوئی طلب نے ساری دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کا توڑ صرف آخرت پر یقین پیدا کرنے اور اخروی انعامات کو ذہنوں میں بٹھانے سے ہی ہوسکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ دنیاوی وسائل کی ناپائیداری اور اخروی نعمتوں کی ابدیت اور ہمیشگی ذہنوں میں بٹھائی جائے۔

﴿مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾(النحل:96)

ترجمہ: جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

روحانی غذا:

اس کے بعد ضروری ہے کہ وہ دلوں کو اس مرض سے بچانے کے بعد اس کی روحانی غذا کا بندوبست کرلیا جائے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ سے مضبوط وپائیدار تعلق کے ذریعہ ہی سے ممکن ہے۔ ذکر وشکر کی انجام دہی اور اس کی بہترین عبادت کرنے سے ہی روحانی غذا مل سکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ترجمہ: میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔ (زاریات:56)

عبادت اپنے عام معنوں میں ان تمام اقوال وافعال پر مشتمل ہے، جو اللہ کے محبوب اور پسندیدہ ہیں، لیکن یہاں عبادت سے مراد اس کا خاص مفہوم ہے، یعنی اس کے شعائر کی اقامت اور ذکر وشکر کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرنا اور مراسمِ عبودیت بجالانا۔

دل کا علاج:

ہم سب آدمؑ کی اولاد ہیں،اس لیے یہ امر باعث حیرت نہیں کہ ہمیں انسانوں میں سے کچھ خطا کار مل جائیں جو احکام واوامر کی خلاف ورزی کرتے ہوں ،منہیات کاارتکاب کرتے ہوں ،لیکن بہترین خطا کار ہیں وہ لوگ جو خطا ہونے کے بعد سچے دل سے توبہ کریں اوراپنے رب سے مغفرت طلب کریں۔یہی وہ علاج ہے جس سے دلوں کو بیماریوں سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

توبہ بالکل سچی توبہ ہونی چاہیے۔استغفار صدق دل سے ہواور یہ سب اس وقت ممکن ہے جب بندے کو گناہ کا احساس ہو،رب کی سزاؤں کا ڈر ہواور سچے جذبۂ عبودیت کے ساتھ اس کے سامنے گریہ وزاری ہواوراپنی کمزوری وانکساری کا کھل کر اعتراف ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں گناہوں سے توبہ کرنے اور قلبِ سلیم بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

دینِ متین کی نشرواشاعت اوراسلامی صحافت کی ترویج میں

''ماہنامہ ندائے حسن'' کا ساتھ دیجیے!!

دین کی نشرواشاعت میں ماہنامہ ندائے حسن چارسدہ کا ساتھ دینے کے لیے آپ خود بھی اس کے قاری بن جائیں اوراپنے اعزہ واحباب کو بھی اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیں۔ہوسکتا ہے کہ ہماری اورآپ کی دعوت سے کسی مسلمان بھائی کو قرآن وحدیث اوراسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے اورزندگی سنوارنے کا موقع مل جائے اورہم اس کے نیک اعمال میں برابر کے حصہ دار بن جائیں!

مستقل قاری بن کرآپ صرف 300 روپے سالانہ میں گھر بیٹھے ماہنامہ ندائے حسن کا شمارہ پڑھ سکتے ہیں۔آج ہی اپنا نام اورڈاک پتہ بھیج کراسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت میں اپنا حصہ ڈالیں۔

فون نمبر:03369985724.0916513080

ای میل ایڈریس:Muftifahim@gmail.com

ای میل ایڈریس:atifshah336@gmail.com

﴿اسلامی زندگی﴾

سلام

(مولانا عنایت شاہ ترناب)

دنیا کے ہر مذہب وقوم کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات کریں تو آپس میں اظہار محبت کے لیے کوئی کلمہ کہیں۔جیسا کہ اسلام سے قبل عربوں کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو'' حياك الله'' یا'' انعم الله بك عينا'' یا''انعم صباحا'' کہتے اسی طرح آج کل غیر مسلم'' good moorning''(گڈ مارننگ)وغیرہ کہتے ہیں،جس کی تقلید آج کل کے کمزور مسلمانوں نے بھی شروع کر رکھی ہے اور ایسا کہنے سے اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں،حالانکہ اس پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا،کچھ لوگ صرف انگلیوں اور ہاتھ کی ہتھیلیوں سے اشارہ کرتے ہیں۔

حضورﷺ کے ایک ارشاد مبارک کا مفہوم ہے کہ جو شخص ہمارے غیروں کے ساتھ مشابہت کرے گا،وہ ہم میں سے نہیں ہے،تم نہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرو نہ عیسائیوں کے ساتھ۔یہودیوں کا سلام کرنا انگلیوں کے ذریعے اشارہ کرنے سے اور عیسائیوں کا سلام کرنا ہتھیلیوں کے ذریعے اشارہ کرنے سے ہوتا ہے۔(سلسلہ احادیث صحیحہ،الحدود والمعاملات والاحکام،رقم الحدیث:1292)

اسلام نے اس طرزِ سلام کو بدل کر السلام علیکم کا طریقہ جاری کیا۔سلام اسلامی تہذیب کا ایک خاص رکن ہے۔

قران حکیم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

﴿واذا حييتم بتحية فحيو ا بأحسن منها أو ردّوها﴾(النساء: 86)

ترجمہ:جب تم کو کوئی مشروع طریقے سے سلام کرے تو تم اس سے اچھے الفاظ میں سلام کرو یا جواب میں ویسے ہی الفاظ کہہ دو۔

السلام علیکم کا مطلب یہ ہے کہ تم ہر تکلیف اور رنج ومصیبت سے سلامت رہو۔موازنہ کیا جائے تو

اسلامی سلام بہت جامع ہے۔اظہار محبت کے ساتھ ساتھ ادائے حق بھی ہے اور دعا بھی ہے۔اس کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم تم سب اللہ تعالی کے محتاج ہیں۔اس معنی کے اعتبار سے یہ ایک عبادت بھی ہے اور دعا کے ضمن میں وہ یہ وعدہ کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہو۔لفظ سلام اللہ تعالی کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے تو اس لحاظ سے بھی السلام علیکم کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالی تمہارا محافظ ہو۔رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده".(بخاری ،کتاب الایمان)

ترجمہ:مسلمان وہ ہے،جس کی زبان اور ہاتھ سے سب مسلمان محفوظ ہوں۔

ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالی نے آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا۔اس کی لمبائی ساٹھ گز تھی اور فرمایا: جاؤ! ان فرشتوں کی جماعت کو سلام کرو۔وہ جو جواب دے گی ،وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہوگا۔چنانچہ آدمؑ اس حکم الٰہی کی تعمیل میں فرشتوں کی اس جماعت کے پاس گئے اور کہا:السلام علیکم !فرشتوں نے جواب دیا:وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔گویا آدمؑ کے سلام کے جواب میں فرشتوں نے لفظ''رحمۃ اللہ'' کا اضافہ کیا۔ (صحیح البخاری،رقم الحدیث:3326)

شروع میں ذکر شدہ قرآن حکیم کی آیت کی تشریح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اچھی طرح سے فرمائی۔چنانچہ ایک مرتبہ حضور ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا: السلام علیکم یا رسول اللہ !تو آپ ﷺ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' فرمایا۔پھر ایک صاحب آئے اور کہا:''السلام علیکم یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ! آپ ﷺ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا:''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''، پھر ایک اور صاحب آئے اور اپنے سلام میں تینوں کلمے جمع کر کے فرمایا:''السلام علیکم یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''! آپ ﷺ نے جواب میں صرف ایک کلمہ''وعلیک'' ارشاد فرمایا۔اس کے دل میں شکایت پیدا ہوگئی،عرض کیا:یا رسول اللہ!.....میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں..... پہلے جو حضرات آئے،آپ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعا کے ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ ﷺ نے ''وعلیک'' پر اکتفا کر لیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:تم نے ہمارے لیے کوئی کلمہ چھوڑا نہیں کہ ہم اضافہ کرتے،تم نے سارے کلمات اپنے سلام میں جمع کرا دیے۔اس لیے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفا کیا۔

سلام کا جواب اچھے الفاظ سے دینے کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا السلام علیکم تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اور اگر اس نے کہا کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے۔ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے، تین کلمے کہنے والے کے جواب میں ایک کلمہ وعلیک کہنا بھی ادا بالمثل کے حکم میں ہے۔

سلام کا جواب دینا واجب ہے، بغیر عذر شرعی جواب نہ دینے سے انسان گنہگار ہوتا ہے اور جواب بہتر الفاظ یا انہیں الفاظ سے دیا جائے۔ بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اور حسن بصری نے فرمایا ہے: ابتداءً سلام کرنے میں اختیار ہے، لیکن جواب دینا فرض ہے، مگر اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں: نماز، خطبہ یا قران مجید کی تلاوت، اذان، اقامت کہہ رہا ہو یا درس دے رہا ہو، انسانی ضروریات مثلاً استنجا وغیرہ میں مشغول ہو۔

سلام اور جواب سلام کے متعلق آداب:

سوار چلنے والے کو سلام کرے اور چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے۔ مقدار میں قلیل لوگ بڑی جماعت پر سے گزرتے وقت سلام کرے۔ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں سلام کرتے۔ اس میں تہذیب ہے۔ جب کوئی شخص کسی کو سلام بھیجے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے سلام کا اسی طرح جواب دے، جس طرح سامنے والے شخص کو سلام کا جواب دیتا ہے۔ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرا والد آپ کو سلام عرض کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''علیک و ابیک السلام'' (سنن ابی داؤد، ابواب السلام، باب فی الرجل یقول فلان یقرئک السلام)

حضور ﷺ نے مُردوں کو اس طرح سلام کیا، جیسے زندوں کو سلام کیا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

"السلام علیکم دار قوم مؤمنین وإنا إن شاء الله بکم لاحقون". (صحیح مسلم ، کتاب الجنائز، باب مایقال عنددخول القبر)

مناسب ہے کہ سلام جمع کے صیغہ کے ساتھ کیا جائے۔ اعمشؒ نے ابرہیم نخعیؒ سے روایت کیا ہے، فرمایا: جب تو ایک شخص کو سلام کرے تو السلام علیکم کہو، کیونکہ اس کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں۔ اس طرح جواب بھی جمع کے صیغہ کے ساتھ ہو۔

عورتوں کوسلام کرنا جائز ،مگر نوجوان عورتیں ،جن سے بات کرنے میں فتنہ کا اندیشہ ہو،اُنہیں سلام نہیں کرنا چاہیے ۔رہی بوڑھی عورتیں تو ان کوسلام کرنا اچھا ہے۔سلام اور جواب میں بلند آواز سنت ہے۔ انگلیوں کا اشارہ دور کے لیے ہے۔جب کوئی شخص سلام کرے اور جس کوسلام کیا ہے، وہ نہ سنے تو اس کی طرف سے سلام شمار نہ ہوگا،اس طرح جواب بھی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:جب تم سلام کروتو سناؤاور جب تم جواب دوتو سناؤ۔

کافر کوسلام کا جواب ''وعلیکم'' سے دیا جائے۔آیت ﴿واذاحییتم بتحیة﴾ سے مراد مومن کی طرف سے جب سلام ہو﴿فحیّو ا بأحسن منها﴾تو اس سے بہتر جواب دواور اگر کافر کی طرف سے ہوتو اس طرح لوٹادو۔جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: کہ انہیں ''وعلیکم'' کہا جائے۔یہود اور عیسایوں کوسلام کرنے میں ابتدا نہ کرو۔ملاقات کے وقت پہلے سلام کرنا چاہیے بعد میں بات چیت۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"السلام قبل الكلام"یعنی سلام کلام سے پہلے ہے۔(سنن ترمذی،حدیث نمبر:2699)

روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرے تو چاہیے کہ پہلے اس کوسلام کرے اور اس کے بعد اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا بڑا پتھر حائل ہو اور پھر ملاقات ہوتو اس کو دوبارہ سلام کرے یعنی بار بار ملاقات پر سلام کرنا چاہیے۔(سنن ابی داؤد،حدیث نمبر:5200)

عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار اس لیے جایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کوسلام کرکے ثواب حاصل کرلے، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا۔لیکن اس وقت کے بازار فتنوں سے خالی تھے،آج کل بازار فتنوں سے بھرے پڑے ہیں،لہٰذا شدید ضرورت کے علاوہ بازاروں کونہیں جانا چاہیے۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا:مسلمان پر مسلمان کے چھ حقوق ہیں: بیمار ہوتو عیادت کرنا،مرجائے تو جنازے میں شرکت کرنا،کھانے پر بلائے تو دعوت قبول کرنا، ملاقات کے وقت سلام کرنا ،چھینکنے کے وقت الحمدللہ کہنے پر جواب میں یرحمک اللہ کہنا، اور مسلمان کی ہر حالت میں خیر خواہی طلب کرنا۔(سنن دارمی،حدیث نمبر:2669)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے

فرمایا: ''کھانا کھلانا اور ہر شناسا اور ناشناسا کو سلام کرنا''۔(صحیح البخاری، حدیث نمبر:6236)

حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ایک شخص آیا اور کہا: السلام علیکم! نبی ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: دس نیکیاں اس شخص کے لیے لکھی گئیں۔ پھر دوسرا شخص آیا اور کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ! نبی ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! نبی ﷺ نے جواب دیا اور فرمایا اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئی ہیں۔(سنن ابی داؤد، باب السلام، باب کیف السلام)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"إن أولى الناس بالله من بدء بالسلام".(سنن ابی داؤد،ابواب السلام،باب فی فضل من بدأبالسلام)

ترجمہ: لوگوں میں سے اللہ کے نزدیک تر وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے۔

گھر میں آتے جاتے وقت سلام کیا کرو۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"يا بني! إذا دخلت على أهلك فسلّم يكون بركة عليك وعلىٰ أهل بيتك".(ترمذی، کتاب الاستیذان والآداب عن رسول الله ،باب ماجاء فی التسلیم اذا دخل بیته)

ترجمہ: اے میرے بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں سے ملو تو سلام کرو، جو تم پر اور تمہارے گھر والوں پر خیر و برکت کے نزول کا باعث ہوگا۔ الغرض سلام کی اتنی اہمیت وفضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی جنتیوں کو سلام فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

﴿سلام قولاً من ربّ رحیم﴾(یاسین:58)

ترجمہ: رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسی اثنا میں کہ جنتی نعمتوں میں ہوں گے کہ ان کے لیے نور چمکے گا، وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائیں گے کہ اللہ تعالیٰ اوپر کی جانب سے ظاہر ہوگا اور فرمائے گا: اے جنتیو! تم پر سلام ہو۔(قرطبی)

قمری ماہ وسال سے متعلق چند بنیادی باتیں
ماہِ محرم کے فضائل، احکام اور منکرات

انتخاب: مولانا ابوحمران حقانی

ماہِ محرم چونکہ قمری سال کا پہلا مہینہ ہے اور اسی سے قمری سال کی ابتدا ہوتی ہے، اس لیے قمری سال سے متعلق چند اہم باتیں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ان باتوں سے جہاں قمری سال کی قدر و قیمت معلوم ہوگی، وہاں متعدد احکام بھی واضح ہوسکیں گے۔ ان شاءاللہ!

قمری سال کا تعلق چاند کے ساتھ ہوتا ہے:

قمری سال بارہ مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو قمری سال اس لیے کہا جاتا ہے کہ جن مہینوں سے یہ قمری سال بنتا ہے، ان کا تعلق چاند کے ساتھ ہے، اسی وجہ سے یہ مہینے بھی قمری مہینے ہی کہلاتے ہیں، جیسا کہ واضح ہے۔ قمری سال کو اسلامی سال بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

قمری سال کے بارہ مہینوں کے نام:

(١) مُحَرَّمُ الْحَرَام (٢) صَفَرُ الْمُظَفَّر (٣) رَبِيْعُ الْأَوَّل
(٤) رَبِيْعُ الثَّانِيُ (٥) جُمَادَى الْأُوْلىٰ (٦) جُمَادَى الثَّانِيَة
(٧) رَجَبُ الْمُرَجَّب (٨) شَعْبَانُ الْمُعَظَّم (٩) رَمَضَانُ الْمُبَارَك
(١٠) شَوَّالُ الْمُكَرَّم (١١) ذُو القَعْدَة (١٢) ذُو الْحَجَّة

تنبیہ:

بہت سے مسلمانوں کو نہ تو قمری مہینوں کے نام یاد ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا صحیح تلفُّظ معلوم ہوتا ہے حتی کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ کونسا مہینہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا، یہ قابلِ اصلاح بات ہے کیوں کہ ان مہینوں سے مسلمانوں کا دینی تعلق بھی ہے اور متعدد احکام کا تعلق بھی انہی مہینوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے ان بارہ مہینوں

کے ناموں کو درست الفاظ اور تلفُّظ کے ساتھ یاد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ اسلامی تہذیب اور معاشرت کا بنیادی تقاضا ہے۔

قمری سال کی بہت بڑی خوبی:

قمری یعنی اسلامی سال کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے بارہ مہینے اللہ تعالیٰ نے خود ہی مقرر فرمائے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورۃ التوبہ آیت نمبر 36 میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾ (التوبة:36)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ہے، جو اللہ کی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) کے مطابق اُس دن سے نافذ چلی آتی ہے، جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ ان بارہ مہینوں میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں۔ یہی دین سیدھا ہے۔'' (آسان ترجمہ قرآن)

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قمری سال کے بارہ مہینے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرمائے ہیں، جس سے اسلامی قمری سال اور اس کے مہینوں کی قدر و قیمت، برتری اور اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

حسابات میں قمری ماہ وسال کی حیثیت اور اھمیت:

قمری سال کی فضیلت اور اہمیت سے متعلق یہ سمجھنا ضروری ہے کہ متعدد وجوہات کی وجہ سے قمری تقویم کو اہمیت، برتری اور فضیلت حاصل ہے، اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قمری تقویم کا اہتمام کریں، اس حوالے سے مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی تفسیر ''معارف القرآن'' سے ایک آیت کی تفسیر نقل کرتے ہیں، تاکہ اس کی روشنی میں یہ اہم موضوع سمجھنے میں سہولت رہے۔ اللہ تعالیٰ سورتِ بقرہ آیت نمبر 189 میں بیان فرماتے ہیں کہ:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾(البقرة:189)

لوگ آپ سے نئے مہینوں کے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ انہیں بتا دیجیے کہ یہ لوگوں (کے مختلف معاملات کے) اور حج کے اوقات متعین کرنے کے لیے ہیں۔'' (آسان

ترجمہ قرآن)

تفسیر:

''آیتِ مذکورہ میں ذکر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ سے ﴿اَہِلَّۃ﴾ یعنی شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہوجاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی یا حکمت ومصلحت کا سوال کیا؟ دونوں احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا، اس میں حکمت ومصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت ومصلحت کیا ہے؟ تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا، جو صحابہ کرام کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت ومصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اَجرامِ سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لیے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے، بڑھنے، چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں؟ اس لیے جواب میں رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہارے مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعے تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہوجائے گا۔

قمری اور شمسی حساب کی شرعی حیثیت:

اس آیت سے تو اتنا معلوم ہوا کہ چاند کے ذریعے تمہیں تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہوجائے گا، جس پر تمہارے معاملات اور عبادات حج وغیرہ کی بنیاد ہے۔ اسی مضمون کو سورۃ یونس کی آیت نمبر 5 میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے: ﴿وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ (یونس: 5)، جس سے معلوم ہوا کہ چاند کو مختلف منزلوں اور مختلف حالات سے گذارنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سال اور مہینوں اور تاریخوں کا حساب معلوم ہوسکے۔ مگر سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 12 میں اس حساب کا تعلق آفتاب سے بھی بتلایا گیا ہے، وہ یہ ہے:

﴿فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا

عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾(الاسراء :15)

ترجمہ: پھر مٹایا رات کا نمونہ، اور بنادیا دن کا نمونہ دیکھنے کو، تا کہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا اور تا کہ معلوم کرو گنتی برسوں کی اور حساب۔

اس تیسری آیت سے اگر چہ یہ ثابت ہوا کہ سال اور مہینوں وغیرہ کا حساب آفتاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے (کما ذکرہ فی روح المعانی)، لیکن چاند کے معاملے میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کیے، ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصًا اُن عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے: روزۂ رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرّم، شبِ براءت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں؛ وہ سب رؤیتِ ہلال سے متعلق کیے گئے ہیں، کیونکہ اس آیت میں ﴿هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ فرما کر بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگر چہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعتِ اسلام نے چاند کے حساب کو اس لیے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا اُفق پر دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے۔ عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی؛ سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلاتِ رصدیہ اور قواعدِ ریاضیہ پر موقوف ہے، جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کرسکتا۔ پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطورِ فرض متعین کردیا اور عام معاملات، تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا، جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے، اگر چہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا کہ اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی وملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے، ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روز مرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔ (معارف القرآن)

خلاصہ:

مذکورہ آیت کی تفسیر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے حسابات اور معاملات میں قمری تقویم کی رعایت کریں، بلکہ اسے غالب رکھیں، یہ فرضِ کفایہ بھی ہے، اسلامی غیرت کا تقاضا بھی ہے، اجر وثواب کا باعث بھی ہے اور ایک درجے میں شعائرِ اسلام میں سے بھی ہے۔ یہ متعدد وجوہات ہیں جن کی وجہ سے قمری تقویم کی رعایت اہمیت رکھتی ہے۔

ایک اور اہم وجہ جس کی وجہ سے قمری تقویم کی پاسداری کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ متعدد احکام کا تعلق قمری تقویم سے ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

متعدد شرعی احکام کا تعلق قمری تقویم کے ساتھ ہے:

شریعت کے متعدد احکام کا تعلق قمری تقویم یعنی اسلامی ماہ وسال کے ساتھ ہے جیسے: مناسکِ حج، ماہِ رمضان کے روزے، عشرہ ذوالحجہ، عیدین، تکبیراتِ تشریق، زکوۃ، قربانی، صدقۃ الفطر، شبِ برأت، پندرہ شعبان، شبِ قدر، عاشورا، بلوغت، نئے مہینے کا چاند دیکھنا اور ان جیسے دیگر احکام۔ اس لیے قمری تقویم کی رعایت اور اہتمام اہمیت کا حامل ہے، خصوصًا ان شرعی احکام میں جن کا تعلق قمری تقویم کے ساتھ ہے، تاکہ جب اسلامی ماہ وسال کا علم ہوگا تو ان احکامات کی پاسداری میں سہولت رہے گی۔

قمری تقویم سے ہماری غفلت اور اس کی ایک اہم مثال:

یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ قمری تقویم یعنی اسلامی ماہ وسال کی نہ تو رعایت کرتے ہیں، نہ اس کے ناموں سے واقف ہیں، نہ اس کے احکام سے واقف ہیں اور نہ اس کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ قمری تقویم کی اہمیت کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلوغت کے بارے میں قمری تاریخِ پیدائش نوٹ کرنے کی اہمیت:

آج ایک المیہ یہ بھی ہے کہ مسلمان والدین اپنی اولاد کی انگریزی یا شمسی تاریخِ پیدائش تو نوٹ کر لیتے ہیں، لیکن قمری تاریخِ پیدائش کی طرف توجہ اور اہمیت ہی نہیں دیتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ قمری تاریخِ پیدائش نوٹ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ حقیقت سمجھ آجائے:

مسئلہ:

جب لڑکے کی عمر قمری یعنی سال کے اعتبار سے 12 سال اور لڑکی کی عمر 9 سال ہو جائے تو اس کے بعد جب بھی بلوغت کی علامات (جیسے لڑکے کو احتلام، انزال وغیرہ، اور لڑکی کو ماہواری، احتلام وغیرہ) ظاہر ہو جائیں تو یہ دونوں بالغ ہو جاتے ہیں، البتہ اگر بلوغت کی کوئی بھی علامت ظاہر نہ ہو تو پھر قمری اعتبار سے 15 سال کی عمر میں دونوں بالغ شمار کیے جائیں گے۔ صحیح مسلم حدیث: 4814 مع تکملۃ فتح الملہم، عالمگیریہ، ملتقی الابحر، کنز الدقائق مع البحر الرائق

اس سے معلوم ہوا کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی بلوغت میں قمری سال کس قدر اہمیت کا حامل ہے، اگر لڑکے یا لڑکی کی قمری تاریخِ پیدائش کا علم نہ ہو تو اس کی بلوغت کا فیصلہ کس قدر مشکل ہوگا؟ کیوں کہ اگر لڑکا یا لڑکی میں بلوغت کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی تو پھر اس کو بالغ قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس کی عمر قمری اعتبار سے 15 سال ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ بھی سمجھیے کہ لڑکی چوں کہ 9 قمری سال سے پہلے بالغ نہیں ہو سکتی، اس لیے اس کو 9 قمری سال سے پہلے جو خون آئے تو اس کو ماہواری یعنی حیض نہیں کہتے، بلکہ وہ استحاضہ یعنی بیماری ہے، اس کی بنا پر اس کو بالغہ شمار نہیں کیا جا سکتا، تو جب اسلامی اور قمری عمر کا علم ہی نہ ہو تو یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ وہ خون حیض ہے یا استحاضہ؟ اور وہ بالغ شمار ہوگی یا نہیں؟

حاصلِ کلام:

یقیناً یہ مثال کافی ہوگی قمری اور اسلامی ماہ و سال کی اہمیت سمجھنے کے لیے!! البتہ ماقبل میں آیت کی تفسیر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ:

> ''عبادات کے معاملے میں تو قمری حساب کو بطورِ فرض متعین کر دیا اور عام معاملات، تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادتِ اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے، اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہو جائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلا دیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ و حج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی مکاتبات میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرتِ قومی وملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر

دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے، ان میں صرف شمسی حساب رکھیں، باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔''
(معارف القرآن)

ہجری سال کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟

ماقبل کی تفصیل سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اسلامی قمری سال اور مہینوں کا آغاز اس کائنات کے روزِ اول ہی سے ہوا، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام جب دنیا میں تشریف لائے تو اسی وقت سے اس پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔ قمری سال کے حوالے سے تو یہاں تک معاملہ یکساں رہا، البتہ سَن کی تعیین میں ہر دور کی عادت مختلف رہی ہے کہ مختلف زمانوں میں لوگ اپنے حسابات، معاملات اور واقعات کی پہچان کے لیے سہولت کی خاطر اپنی تہذیب وتمدن اور قوم وقبیلے کے اعتبار سے کسی اہم واقعے اور سانحے کو بنیاد بنا کر سَن کا حساب لگاتے تھے تاکہ آسانی رہے، جیسے اگر کسی واقعے کی پہچان مقصود ہو کہ یہ کب پیش آیا؟ تو وہ یہ کہہ دیتے کہ یہ واقعہ طوفانِ نوح کے تیسرے سال پیش آیا، یا یہ معاملہ اصحابِ فیل کے واقعے کے دوسرے سال طے ہوا۔ اس طرح مختلف اہم واقعات سَن کی بنیاد بنائے گئے، گویا کہ کسی نے حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت کو سَن مقرر کیا، کسی نے طوفانِ نوح کو، کسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کو، کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی نجات کو، تو کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو سن مقرر کیا؛ الغرض یہ سلسلہ چلتا رہا۔

اس حوالے سے امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے امام شعبی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ: ''جب اولادِ آدم کی کثرت ہوگئی تو انہوں نے آدم علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے کو سن مقرر کیا، پھر یہاں سے یہ سلسلہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے تک چلا، یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے نکلنے تک چلا، پھر یہاں سے حضرت داود علیہ السلام تک چلا، اس طرح یہ تاریخی سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جا پہنچا۔''

حضور اقدس ﷺ کی بعثت کے زمانے میں بھی عرب میں بعض اہم واقعات، سانحات، جنگوں، واقعہ اصحابِ فیل یا تعمیرِ بیت اللہ کو بنیاد بنا کر سَن کی تعیین اور حساب لگانے کا معمول تھا، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں فتوحات کی کثرت ہوئی اور حسابات کی پہچان کے لیے سن کی تعیین کی ضرورت بڑھ گئی تو

انھوں نے جلیل القدر صحابہ کرام کی مشاورت سے حضور اقدس ﷺ کی مکہ سے مدینہ ہجرت کو بنیاد بنا کر وہیں سے ہجری سن کا آغاز فرمایا۔اس طرح یہ جاننا آسان ہوگیا کہ کون سا واقعہ ہجرت کے کون سے سال پیش آیا اور یہ سلسلہ الحمدللہ آج تک جاری ہے۔بعض روایات کے مطابق حضور اقدس ﷺ کے حکم ہی سے ہجرت کے وقت ہجری سن مقرر ہوا،اس بات کو تسلیم کرنے کی صورت میں پہلے قول کا مطلب یہ ہوگا کہ ہجری سن تو حضور اقدس ﷺ ہی کے دور میں مقرر ہوا،البتہ سرکاری طور پر حسابات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا۔واللہ تعالیٰ اعلم!

اس کی تفصیل ''عمدۃ القاری'' میں ملاحظہ فرمائیں:

بابُ التَّارِيخِ: مِنْ أَيْنَ أَرَّخُوا التَّارِيخَ؟

أَي: هَذَا بَاب فِي بَيَان التَّارِيخ: هُوَ تَعْرِيف الْوَقْت وَكَذَلِكَ التوريخ ....قَوْله: (من أَيْن أَرخُوا التَّارِيخ؟) أَي: ابْتِدَاء التَّارِيخ من أَي وَقت كَانَ، وَفِيه اخْتِلَاف فروى ابْن الْجَوْزِيّ بِإِسْنَادِهِ إِلَى الشّعبِيّ، قَالَ: لما كثر بَنو آدم فِي الْأَرْض وانتشروا أَرخُوا من هبوط آدم .....عَلَيْهِ الصَّلَاة وَالسَّلَام..... ثمَّ إِلَى زمَان يُوسُف عَلَيْهِ السَّلَام ثمَّ إِلَى خُرُوج مُوسَى عَلَيْهِ السَّلَام من مصر بنى اسرائيل ثمَّ إِلَى زمَان دَاوُد عَلَيْهِ السَّلَام، فَكَانَ التَّارِيخ مِنْهُ إِلَى الطوفان، ثمَّ إِلَى نَار الْخَلِيل عَلَيْهِ الصَّلَاة وَالسَّلَام، ثمَّ إِلَى زمَان سُلَيْمَان عَلَيْهِ الصَّلَاة وَالسَّلَام، ثمَّ إِلَى زمَان عِيسَى عَلَيْهِ الصَّلَاة وَالسَّلَام، وَرَوَاهُ أَيْضا ابْن إِسْحَاق عَن ابْن عَبَّاس رَضِي الله تَعَالَى عَنْهُمَا، وَحكى مُحَمَّد بن سعد عَن ابْن الْكَلْبِيّ: أَن حِمير كَانَت تؤرخ بالتبابعة، وغسان بالسدّ، وَأهل صنعاء بِظُهُور الْحَبَشَة على الْيمن، ثمَّ بِغَلَبَة الْفرس، ثمَّ أرخت الْعَرَب بِالْأَيَّامِ الْمَشْهُورَة: كحرب البسوس، وداحس، والغبراء، وبيوم ذِي قار، والفجارات وَنَحْوهَا، وَبَين حَرْب البسوس ومبعث نَبينَا ﷺ سِتُّونَ سنة .وَقَالَ ابْن هِشَام الْكَلْبِيّ عَن أَبِيه: أما الرّوم فَأَرخت بقتل دَارا بن دَارا إِلَى ظُهُور الْفرس عَلَيْهِم، وَأما القبط فَأَرخت ببخت نصر إِلَى قلابطرة صَاحِبَة مصر، وَأما الْيَهُود

فَأَرخت بخراب بَيت الْمُقَدّس، وَأما النَّصَارَى فبرفع الْمَسِيح عَلَيْهِ الصَّلَاة وَالسَّلَام .وَأما ابْتِدَاء تَارِيخ الْإِسْلَام فَفِيهِ اخْتِلَاف أَيْضا فروى الْحَافِظ ابْن عَسَاكِر فِي "تَارِيخ دمشق": عَن أنس بن مَالك أَنه كَانَ التَّارِيخ من مقدم رَسُول اللهﷺ الْمَدِينَة فِي ربيع الأول، فأرخوا. وَعَن ابْن عَبَّاس: قدم النَّبِي ﷺ الْمَدِينَة وَلَيْسَ لَهُم تَارِيخ، وَكَانُوا يؤرخون بالشهر والشهرين من مقدمه، فأقاموا على ذَلِك إِلَى أَن توفّي النَّبِي ﷺ، وَانْقطع التَّارِيخ، وَمَضَت أَيَّام أبي بكر على هَذَا وَأَرْبع سِنِين من خلَافَة عمر على هَذَا، ثمَّ وضع التَّارِيخ، وَاخْتلفُوا فِي سَببه، فروى ابْن السَّمرقَنْدِي: أَن أَبَا مُوسَى الْأَشْعَرِيّ رَضِي الله تَعَالَى عَنهُ كتب إِلَى عمر رَضِي الله تَعَالَى عَنهُ أَنه يأتينا مِنْك كتب لَيْسَ لَهَا تَارِيخ، فأرخ لتستقيم الْأَحْوَال، فأرخ .وَقَالَ أَبُو الْيَقظَان: رفع إِلَى عمر صك مَحَله فِي شعْبَان، فَقَالَ: أَي شعْبَان هَذَا؟ الَّذِي نَحن فِيهِ أم الْمَاضِي أم الَّذِي يَأْتِي؟ وَقَالَ الْهَيْثَم ابْن عدي: أول من أرخ يعلى بن أُميَّة، كتب إِلَى عمر من الْيمن كتابا مؤرخًا فَاسْتَحْسَنَهُ وَشرع فِي التَّارِيخ .وَقَالَ ابْن عَبَّاس: لما عزم عمر على التَّارِيخ جمع الصَّحَابَة فاستشارهم، فَقَالَ سعد بن أبي وَقاص: أرخ لوفاة رَسُول الله ﷺ، وَقَالَ طَلْحَة: أرخ لمبعثه، وَقَالَ عَليّ بن أبي طَالب: أرخ لهجرته؛ فَإِنَّهَا فرقت بَين الْحق وَالْبَاطِل، وَقَالَ آخَرُونَ: لمولده، وَقَالَ قوم: لنبوته، وَكَانَ هَذَا فِي سنة سبع عشرَة من الْهِجْرَة، وَقيل: فِي سنة سِتّ عشرَة، وَاتَّفقُوا على قَول عَليّ رَضِي الله تَعَالَى عَنهُ، ثمَّ اخْتلفُوا فِي الشُّهُور، فَقَالَ عبد الرَّحْمَن بن عَوْف: أرخ لرجب؛ فَإِنَّهُ أول الْأَشْهر الْحرم، وَقَالَ طَلْحَة: من رَمَضَان؛ لِأَنَّهُ شهر الْأمة، وَقَالَ عَليّ: من الْمحرم؛ لِأَنَّهُ أول السّنة.

﴿تحقیقی مضامین﴾

مقامِ بخاریؒ

(دوسری قسط)

تدوین احادیث کے مختلف ادوار اور مقام امام بخاری:

احادیث کی کتابت اگرچہ عہد نبوی ﷺ میں ہوئی، جیسا کہ ذکر ہوا، لیکن احادیث کی باقاعدہ تدوین عہد اُموی میں خلیفہ عادل عمر بن عبد العزیز المتوفی ۱۰۱ھ کے ایک فرمان کے ذریعے ہوئی، جو آپ نے قاضی مدینہ ابوبکر بن محمد الانصاری المتوفی ۱۲۰ھ کو لکھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ احادیثِ رسول ﷺ کو تلاش کر کے قلمبند کرو، اس لیے کہ مجھے احادیث کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

اس حکم کی تعمیل کے سلسلے میں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ دورِ اموی میں اس فرمان کے تحت کون سی کتابیں لکھی گئیں، البتہ دورِ عباسی میں دوسری صدی کے نصف سے باقاعدہ تدوینِ احادیث کا سلسلہ شروع ہوا، جس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

تدوینِ حدیث کا دورِ اول:

دورِ اول میں فقہی ابواب کے تحت، احادیث مرفوعہ اور اقوال صحابہ وفتاویٰ تابعین کو مرتب کیا گیا، چنانچہ متعدد مجموعے مذکورہ بالا شکل میں مدوّن ہوئے۔ مکہ میں ''ابن جریج'' المتوفی ۱۵۰ھ، مدینہ منورہ میں محمد بن اسحٰق المتوفی ۱۵۱ھ، امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ، بصرہ میں ربیع بن صبیح المتوفی 160ھ، سعید بن عروبہ المتوفی 156ھ، حماد بن سلمہ المتوفی 176ھ، کوفہ میں سفیان ثوری المتوفی 161ھ، شام میں اوزاعی المتوفی 156ھ، یمن میں معمر المتوفی 153ھ، خراسان میں ابن المبارک المتوفی 181ھ اور مصر میں لیث بن سعد المتوفی 175ھ نے فقہی ترتیبِ ابواب کی شکل میں مختلف مجموعے مرتب کیے۔ یہ اندازہ لگانا کہ ان بزرگوں میں سے کس بزرگ نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب لکھی، مشکل ہے۔ البتہ ان بزرگوں میں سے ابن جریج کی وفات سب سے پہلے ۱۵۰ھ میں ہوئی، لہٰذا قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی کتاب سب سے مقدم لکھی گئی

ہوگی،لیکن ان مذکورہ مجموعات میں سے اس وقت ہمارے ہاتھوں میں صرف موطا امام مالکؒ موجود ہے۔

تدوینِ حدیث کا دورِ دوئم : (تدوینِ مسانید)

اس دور میں محدثین نے فقہی ابواب پر تدوینِ احادیث کا طریقہ ترک کر کے ایک نئے طریقے سے احادیث کو مدون کیا۔یعنی ہر صحابی کی مرویات کو یکجا جمع کر دیا،مثلاً حضرت عمرؓ کی جملہ مرویات کو مسند عمر کے تحت جمع کر دیا۔اگر چہ وہ مرویات فقہی احکام کے لحاظ سے مختلف ابواب سے تعلق رکھتی تھیں۔اس طرزِ عمل سے یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ ایک صحابی کی حدیثیں خواہ وہ کسی بات سے بھی متعلق ہوں،اس صحابی کے نام کے تحت ایک جگہ جمع ہوگئیں،لیکن ایک فقیہ کو کسی فقہی حکم کے استخراج کے لیے حدیث معلوم کرنے میں سخت دشواری پیش آنے لگی،کیونکہ فقہی ابواب نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی حدیث کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوا۔اس قسم کے مسانید میں دورِ اول کے برخلاف یہ التزام بھی کیا گیا کہ ان میں صرف مرفوعات یعنی احادیث نبویہ ﷺ کو درج کیا جائے اور اقوالِ صحابہ وتابعین ان میں شامل نہ ہوں۔گویا دورِ ثانی کے اس طرز سے مرفوعات وموقوفات کا امتیاز قائم ہوا۔یہ سلسلہ دوسری صدی سے شروع ہوا۔اس انداز کی کتب میں سے مسند امام احمد ،مسند عبیداللہ بن موسیٰ الکوفی،مسند مسدد بن مسرہد البصری وغیرہ ہیں۔بعض کتابوں پر اس اصطلاح کے خلاف ''مسند'' کا اطلاق کیا گیا ہے،جیسے مسند دارمی اور مسند حارث بن اسامہ،کہ ان کی ترتیب اگر چہ ابواب فقہی پر ہے،مگر پھر بھی ان کو مسند کہا جاتا ہے۔

تدوینِ حدیث کا دورِ سوم:

دورِ اول میں اقوالِ نبویہ اور اقوالِ صحابہ وتابعین یعنی مرفوعات وموقوفات سب مخلوط تھے،جن کے درمیان امتیاز ضروری تھا۔چنانچہ دورِ ثانی کے مسانید مثلاً مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ نے اس ضرورت کو پورا کیا اور مسانید میں صرف مرفوعات اور احادیث رسول پر ہی اکتفا کیا گیا،لیکن ان مرفوعات میں صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز نہ تھا،اس لیے ضرورت تھی کہ ایک ایسی کتاب لکھی جائے،جو صرف صحیح احادیث پر مشتمل ہو،تاکہ صحیح اور ضعیف احادیث میں امتیاز ہو سکے۔

الصحیح للبخاری:

ایک بار امام بخاری اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کی مجلسِ درس میں بیٹھے تھے۔امام اسحاق نے فرمایا

کہ کیا ہی اچھا ہوگا، کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ سنن میں کوئی ایسی کتاب تیار کردے کہ جس میں صرف وہ حدیثیں جمع ہوں، جو صحت میں اعلیٰ مرتبہ رکھتی ہوں، تاکہ عمل کرنے والا ان پر عمل کرسکے۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ چنانچہ امام بخاریؒ کے پاس جو چھ لاکھ احادیث کا ذخیرہ موجود تھا، ان میں سے انتخاب کرکے ''صحیح البخاری'' کے نام سے سات ہزار دوسو پچھتر احادیثِ صحیحہ کا مجموعہ مرتب کیا اور بہت سی صحیح حدیثوں کو بوجہ طوالت یا دیگر وجوہات کے کتاب میں درج نہیں کیا۔ یہ تصریح خود امام بخاریؒ نے کی ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو حدیث بخاری میں نہ ہو تو وہ صحیح نہیں۔

فنِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح حدیث کس کو کہتے ہیں؟ تو جان لیجیے کہ علمِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح حدیث وہ ہے، جس میں امور ذیل موجود ہوں:

(۱).....راویوں کا سلسلہ اس طرح باہم متصل اور پیوست ہو کہ درمیان میں کوئی راوی چھوٹا نہ ہو (رہ نہ گیا ہو)۔ لہذا معلق، مرسل، منقطع اور معضل حدیثیں صحیح حدیث کی تعریف میں داخل نہیں، کیونکہ معلق میں سلسلہ اسناد کے پہلے راوی کو اور مرسل میں آخری راوی کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور منقطع میں سند کے درمیان میں سے ایک یا دو راوی (ایک ساتھ نہیں بلکہ جدا جدا) حذف کردیے جاتے ہیں اور معضل میں اسناد کے اندر متعدد راوی ایک ساتھ چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک راوی کو ذکر کیا تو اس کے بعد دوسرے کو ذکر نہ کیا، پھر تیسرے کو ذکر کرکے چوتھے کو ذکر نہ کیا۔

(۲).....حدیث کے رواۃ ثقہ یعنی عادل وضابط ہوں، لہذا ایسی حدیث صحیح نہیں، جس کو کوئی ایسا راوی روایت کرے، جس کی شخصیت یا ثقاہت معلوم نہ ہو یا ضعیف ہو یا غفلت وخطا سے موصوف ہو۔

(۳).....وہ حدیث شاذ اور معلل نہ ہو، یعنی ایسے راویوں کی روایت نہ ہو کہ ان راویوں سے زیادہ قوی رواۃ یا کثیر التعداد رواۃ اس کے خلاف روایت کرچکے ہوں، کیونکہ کسی راوی سے قوی تر راوی کی مخالفت یا دیگر متعدد قوی راویوں کی مخالفت، اس راوی کی روایت کو مشتبہ بناتی ہے۔ اس لیے ایسے راوی کی روایت کو صحیح نہیں کہا جا سکتا، اگرچہ راوی بذاتِ خود قوی ہو۔

شرائط صحیح البخاری :

کسی محدث نے بھی اپنی کتاب میں اندراجِ حدیث کے لیے واضح الفاظ میں شرائط کی تصریح نہیں

کی، لیکن ماہرینِ فن حدیث و رجال نے مطالعہ و تحقیقِ کتاب کے بعد اس کتاب کی جن شرطوں کو دریافت کیا ،ان کو اسی کتاب کی شرائط قرار دے دیا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں جو حدیث ذکر ہوگی، وہ ان شرائط کی جامع ہوگی۔ صحیح البخاری کی چھان بین کر کے محدثین نے اس سلسلے میں جو معلوم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کتاب کی ہر حدیث میں شرائط ذیل کی پابندی کی گئی ہے:

(۱).....سند متصل ہو۔

(۲)..... ہر راوی ثقہ ہو۔

(۳).....اس کی روایت دیگر قوی تر رواۃ کے خلاف نہ ہو۔

(۴)..... ہر راوی جو دوسرے راوی سے روایت کرے، ان دونوں کی ملاقاتِ باہمی تاریخاً ثابت ہو۔

(۵).....سلسلہ رواۃ میں استاذ شاگرد کے درمیان طویل صحبت و رفاقت رہ چکی ہو اور اگر رفاقت باہمی کا زمانہ کم ہو تو یہ ضروری ہے کہ راوی کا حافظہ غیر معمولی ہو۔

ان معیاری اور انتہائی محتاط شرائط کی بنیاد پر علمائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن حکیم کے بعد صحیح تر کتاب صحیح البخاری ہے۔

متعلقات صحیح البخاری:

امام بخاری کے شیوخ اور اساتذہ کی تعداد آٹھ سو ہے اور جن شاگردوں کو امام بخاریؒ نے بالذات درس صحیح بخاری دیا، ان کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ صحیح البخاری کے کل انیس نسخے ہیں، جن میں الفاظ اور ترتیب کا معمولی سا فرق ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں اس وقت جو نسخہ ہے، وہ محمد بن یونس فربری کا ہے۔ ان نسخوں میں ایک نسخہ کریمہ بنت احمد کا بھی ہے، جو ایک خاتون محدثہ ہے اور بہت سے محدثین نے اس سے حدیث کی تعلیم حاصل کی ہے۔

ثلاثیات یعنی ایسی حدیثیں جن میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام اور امام بخاریؒ کے درمیان صرف تین راویوں کا واسطہ ہے، ان کی تعداد اکیس ہے۔ امام بخاریؒ نے کتب یا ابواب کے نام سے جو عنوانات قائم کیے ہیں، ان کتب کی تعداد ایک سو اور ابواب کی تعداد تین ہزار چار سو پچاس ہے۔ صحیح بخاری کی قدیم شروحات کی تعداد ترپّن (۵۳) ہے اور جدید شروح بخاری ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے باوجود علامہ ابن خلدون کو اپنے

مقدمہ تاریخ میں لکھنا پڑا کہ صحیح البخاری کی کامل شرح اب تک اس اُمت پر قرض ہے، جوادانہیں کیا گیا، امام بخاری نے یہ کتاب سولہ برس میں لکھی، جس میں کل احادیث 7275 اور مکررات کو چھوڑ کر چار ہزار حدیثیں ہیں۔

صحیح البخاری کی خصوصیات:

پہلی خصوصیت:

امام بخاریؒ سے قبل اکثر محدثین کے جمع حدیث کا دائرہ محدود تھا۔امام مالکؒ نے اہل مدینہ کی احادیث اور ابن جریج نے اہل حجاز واہل مکہ کی روایات کو جمع کیا۔امام بخاری نے طلبِ حدیث میں اکثر ممالک اسلامیہ کا سفر کیا، اس لیے آپ کی کتاب میں معلومات حدیث کے اعتبار سے شانِ جامعیت پائی جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت:

امام بخاریؒ سے قبل محدثین اپنی کتب حدیث میں ایک حدیث صرف ایک ہی فقہی باب میں لاتے تھے، جس سے صرف ایک ہی فقہی حکم مستنبط ہوتا تھا، لیکن امام بخاری ایک حدیث یا اس کے مختلف ٹکڑوں کو متعدد فقہی ابواب کے تحت لاکر اس سے مختلف فقہی مسائل واحکام کا استخراج کرتے ہیں۔اس طرح صحیح البخاری میں فقہی مسائل واحکام کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا جو دیگر کتابوں میں نہیں اور یہ صحیح البخاری کی دوسری خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف حدیث، بلکہ حدیث سے مستنبط احکام کی بھی ایک جامع کتاب ہے۔

تیسری خصوصیت:

امام بخاری سے قبل اور ان کے بعد محدثین کا طرز یہ رہا ہے کہ وہ فقہی ابواب کے تحت صرف اسی حدیث کو لاتے تھے، جس کے الفاظ سے وہ فقہی حکم صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہو، لیکن امام بخاری باب کے تحت ایسی حدیث بھی لاتے ہیں، جس سے اس باب کا فقہی حکم واضح طور پر نہیں نکلتا، بلکہ مجتہدانہ فکر ونظر کے تحت اس حکم کو حدیث مذکور سے نکالا جاسکتا ہے۔صحیح البخاری کی یہ خصوصیت ہے جس کے متعلق شارحین کتاب نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ ''فقہ البخاری فی تراجمہ'' یعنی امام بخاری کی مجتہدانہ فہم وفراست کا اندازہ ان کتابوں کے تراجم وابواب یعنی عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

چوتھی خصوصیت:

صحیح البخاری میں مطالبِ احادیث کے اعتبار سے شان جامعیت پائی جاتی ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے:

سیر ، آداب و تفسیر و عقائد
فتن ، احکام و اشراط و مناقب

صحیح البخاری سے قبل کوئی کتاب ان ہشتگانہ مضامین کی جامع نہ تھی۔ بخاری پہلی کتاب ہے، جو ان سب مضامین کی احادیث کا مجموعہ ہے۔ بخاری کے بعد ان کے شاگرد امام ترمذی نے بھی صحیح بخاری کے تتبع پر جامع ترمذی لکھی اور یہی وہ دو کتابیں ہیں، جن کو جامع کہا جاتا ہے۔

پانچویں خصوصیت :

صحیح البخاری میں ایک ہی حدیث کی عبارت بار بار لائی گئی ہے، اس لحاظ سے اس میں الفاظ حدیث کے اعتبار سے تکرار موجود ہے، لیکن چونکہ ہر جگہ سند مختلف ہے، اس لیے اسنادی تکرار اس میں نہیں۔ اس سے ایک بڑا حدیثی فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ ایک ہی حدیث کو متعدد اسانید سے بیان کرنے میں صحتِ حدیث مضبوط ہو جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کا تردد باقی نہیں رہتا۔

چھٹی خصوصیت : تقدم اور مقبولیت :

فربری شاگرد نے امام بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے اس کتاب میں ہر حدیث لکھنے سے قبل غسل کیا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی۔ اس حساب سے کسر چھوڑ کر اگر بخاری کی حدیثیں صرف سات ہزار قرار دی جائیں تو گویا امام بخاریؒ نے اس کتاب کی تکمیل کے دوران سات ہزار مرتبہ غسل کیا اور چودہ ہزار رکعات پڑھیں۔

کتاب کی تکمیل کے بعد امام بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ گویا رسول اللہ ﷺ میرے سامنے ہیں اور میں ان سے مکھیاں ہٹا رہا ہوں، جس کی تعبیر یہ نکلی کہ اس کتاب کے ذریعے موضوع اور ضعیف روایات کو دور کر دیا گیا۔ اسی طرح ایک محدث کو حضور ﷺ نے خواب میں ارشاد فرمایا کہ تم میری کتاب کیوں نہیں پڑھتے۔ اس نے عرض کیا کہ حضور ﷺ آپ کی کتاب کون سی ہے؟ فرمایا ''صحیح البخاری''۔

امام بخاریؒ کا فقہی مذہب:

امام سبکیؒ نے امام بخاریؒ کو شافعی المذہب قرار دیا ہے، اس لیے اپنی کتاب ''طبقاتِ شافعیہ'' میں ان کا ذکر کیا ہے، جو صرف شافعی علما کی مخصوص تاریخ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بخاریؒ حدیث میں زعفرانی اور ابوثور کے شاگرد ہیں اور فقہ میں حمیدی کے اور یہ تینوں امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔ ہمارے خیال میں استادی شاگردی ہم مذہب ہونے کی دلیل نہیں، ورنہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاریؒ حنفی المذہب ہیں، کیونکہ وہ مکی بن ابراہیم کے شاگرد ہیں اور وہ حنفی ہیں، بلکہ صحیح یہ ہے کہ امام بخاری مقلد نہیں، مجتہد ہیں اور ان کے اجتہادات اکثر امام ابوحنیفہ کے مطابق ہیں۔ صرف چند مشہور مسائل میں ان کا اجتہاد امام ابوحنیفہؒ کے خلاف ہے۔ مثلاً ''فاتحہ خلف الامام''، ''آمین بالجہر''، ''رفع الیدین فی اول الرکوع وآخرہ'' وغیرہ۔ چنانچہ یہ بات صحیح بخاری کے مطالعہ سے نمایاں ہے۔ صحیح بخاری میں صرف دو جگہ باب ''الرکاز'' اور تفسیر ''العرایا'' میں امام شافعی کا ذکر آیا اور متعدد جگہوں میں امام ابوحنیفہؒ کے بعض مسائل کی تردید بھی کی ہے، جن کا جواب حنفیہ نے دیا ہے۔

امام بخاریؒ کی والدہ کی دعا:

امام بخاری بچپن میں نابینا ہو گئے تھے، جس کے لیے آپ کی والدہ جو پارسا خاتون تھیں، رو رو کر دعائیں کرتی تھیں۔ ایک شب آپ کی والدہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دیکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تمہارے بیٹے کی بینائی تمہارے رونے اور دعا کی وجہ سے درست ہوگئی ہے۔ صبح اُٹھ کر جب اپنے بیٹے (امام بخاری) کو دیکھا تو واقعی ان کی نگاہ درست ہوگئی تھی۔

مآخذ مقالہ ھذا :

مقدمہ فتح الباری ،تاریخ بغداد للخطیب ،طبقاتِ شافعیہ لتاج الدین سبکی ،تذکرۃ الحفاظ للذھبی ، تدریب الراوی للسیوطی ، توجیہ النظر للجزائری ،بستان المحدثین لشاہ عبدالعزیز دھلوی ،تاریخ نیسابور للحاکم ، اتحاف النبلاء لصدیق حسن خان ،تاریخ ابن خلکان ، مقدمہ ابن خلدون ،فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث وغیرہ ۔

﴿تحقیقی مقالات ومضامین﴾

نبی کریم ﷺ بطور سپہ سالار

(چوتھی قسط)

مفتی محمد فہیم اللہ (مدیر ماہنامہ ندائے حسن)

دشمن کے جاسوسوں پر نظر رکھنا:

گزشتہ قسط میں یہ بات تفصیل سے گزر چکی کہ نبی کریم ﷺ جنگی مہمات میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرماتے، لیکن مشورہ لینے میں یہ خیال ضرور فرماتے کہ جنگی حکمتِ عملی دشمن پر ظاہر نہ ہوجائے۔ آپ ﷺ جنگ کو بہترین چال قرار دیتے تھے، لہذا کوشش یہ ہوتی کہ جنگی چال کسی دشمن کے سامنے ظاہر نہ ہو۔

اس کی بہترین مثال بخاری ومسلم کی وہ حدیث ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کو علم ہوا کہ دشمن کا کوئی جاسوس مسلمانوں کے لشکر میں گھس گیا ہے اور صحابہ کرام کی مجلس میں بیٹھ کر باتیں جاننے کی کوشش کررہا ہے۔ سلمہ بن اکوعؓ کی متفق علیہ حدیث ہے:

أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ عَيْنٌ مِن المُشرِكِينَ وَهُوَ فِي سَفَرٍ فَجَلَسَ عِنْدَ أَصحَابِهِ يَتَحَدَّثُ ثُمَّ انْفَتَلَ، فَقَالَ النَّبِيﷺ: اُطْلُبُوهُ وَاقْتُلُوهُ فَقَتَلَهُ فَنَفَّلَهُ سَلَبَهُ.

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں مشرکین کا کوئی جاسوس نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور صحابہ کے ساتھ بیٹھ کر بات کرتا رہا، پھر خاموشی سے کھسک گیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسے ڈھونڈو اور قتل کرڈالو''۔ میں نے اسے قتل کردیا تو آپ ﷺ نے اس کا سامان (تلوار، گھوڑا وغیرہ) مجھے بطور نفل (انعام) عنایت فرمایا۔

مخصوص جنگی الفاظ (Code Words) کا استعمال:

وہ خاص لفظ، جو پہرے داروں یا فوجیوں کو اپنے لوگوں کی شناخت کے لیے بتادیا جائے، تاکہ دورانِ جنگ انہیں دھوکہ نہ دیا جائے، اسے ''شعار'' اور جدید دَور میں کوڈ ورڈ کہتے ہیں۔ آج کل اس کی بہت

اہمیت بتائی جاتی ہے،لیکن ہمارے پیارے نبی اور بہترین سپہ سالار نے ساڑھے چودہ سوسال پہلے اس کی اہمیت بتادی تھی اور جنگوں میں باقاعدہ طور پر اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔بطور مثال چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عَنْ سَمُرَةَ بنِ جُندُبٍ قَالَ: كَانَ شِعَارُ الْمُهَاجِرِيْنَ عَبْدَ اللّٰهِ وَشِعَارُ الْأَنْصَارِ عَبْدَ الرَّحمٰنِ.(سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد ،باب في الرجل ينادي بالشعار : رقم : 6595)

ترجمہ:سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین کا شعار (کوڈ ورڈ) لفظ عبداللہ تھا اور انصار کا شعار لفظ عبدالرحمٰن تھا۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ یہ شعار ہر ہر جنگ میں الگ الگ ہوتا تھا۔درج ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

عَنْ إِيَاسِ بْنِ سَلَمَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: غَزَونَا مَعَ أَبِي بَكرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ زَمَنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ ، فَكَانَ شِعَارُنَا: أَمِتْ أَمِتْ.(سنن أبي داؤد ، رقم :6596)

حضرت ایاس بن ابی سلمہ اپنے باپ (سلمہ بن اکوعؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جہاد کیا،اس جہاد میں ہمارا شعار "اَمِتْ اَمِتْ" (یعنی دشمن کو مارو،دشمن کو مارو) تھا۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے لشکر بھیجتے وقت ہدایت فرمائی:

إِن بُيِّتُّم فَلْيَكُن شِعَارُكُم حم لَا يُنصَرُونَ.(سنن أبي داؤد :6597)

ترجمہ:اگر دشمن تمہارے اوپر شب خون ماریں تو تمہارا شعار (کوڈ) "حم لایُنْصَرُوْنَ" (دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل نہیں ہوگی) ہونا چاہیے۔

دشمن کی نقل وحرکت پر نظر :

یعنی بہترین انٹیلی جنس اور جاسوسی نظام :

جس طرح دشمن کو اپنے حالات اور نقل وحرکت سے حتی الوسع بے خبر رکھنا ضروری ہے،اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ دشمن کی نقل وحرکت اور حالات سے مکمل آگاہی ہو۔اس بارے میں نبی کریم ﷺ کا جاسوسی نظام اپنے دشمن کی نسبت زیادہ متحرک اور فعال تھا۔ذیل میں چند واقعات اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(ا) جنگِ بدر اور جنگ اُحد میں قریش کی تیاری سے خبرداری:

نبی کریم ﷺ حریف قبائل میں اپنے آدمی مقرر فرماتے جو آپ ﷺ کو حالات سے باخبر رکھتے۔ مکہ مکرمہ جیسے سخت اور مرکزی جگہ میں آپ ﷺ کے جاسوس موجود تھے۔ جنگ بدر اور جنگ احد سے متعلق قریش مکہ کی تیاری کی خفیہ رپورٹیں آپ ﷺ کو حضرت عباسؓ کی طرف سے مل رہی تھیں۔ (رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار: ص ۵۴، بحوالہ تاریخ اسلام، از پروفیسر حمید الدین)

اپنے جاسوسوں کے ان مسلسل خبروں کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں رات کو پہرہ داری کا سخت نظام مقرر فرمایا تھا۔ (بخاری، کتاب الجہاد، باب الحراسۃ)

(۲) قافلہ ابوسفیان کی جاسوسی:

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کے قافلے کی جاسوسی کے لیے بسیسۃ نامی صحابی کو جاسوس کے طور پر بھیجا تھا۔ (صحیح مسلم، سنن ابی داؤد: 2618)

(۳) طلایہ گردی یا Petroling:

مدنی زندگی کی ابتدا میں قریش کی طرف سے حملے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں کئی جاسوسی دستے قریش کے تجارتی راستے کی طرف بھیجے۔ ان گشتی اور جاسوسی دستوں کو عربی میں طلیعہ اور اُردو میں طلایہ گرد کہا جاتا ہے۔ سریہ رابغ، سریہ سعد بن ابی وقاص یا سریہ ضرار، غزوۂ بُواط، غزوۂ صفوان اور سریہ عبداللہ بن جحشؓ اسی قسم کے جاسوسی دستے تھے۔ (رسول اللہ ﷺ بحیثیت سپہ سالار: 44)

(۴) غزوۂ احزاب میں دشمن کے کیمپ میں گھس کر جاسوسی:

جنگ احزاب میں مسلمانوں کی مالی کمزوری، سخت سردی اور دشمن کے تیس ہزار سورماؤں کی خندق کے اُس پار خیمہ زنی نے مسلمانوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ ایسی سخت حالت میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا: ''کوئی ہے جو جا کر دشمن کی خبر لائے''۔ سردی اور بھوک سے تو ویسے بھی برا حال تھا، اوپر سے دشمن کے کیمپ میں گھسنا کسی چیلنج سے کم نہیں تھا، لیکن زبیر بن عوامؓ یا دوسری روایت کے مطابق حضرت حذیفہؓ اس مشکل کام کے لیے تیار ہو گئے اور نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق کامیابی کے ساتھ واپس لوٹے۔ (عیون الاثر: ۲/۴۳، بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب ھل یبعث الطلیعۃ.....)

اس قسم کی اور بھی درجنوں مثالیں ہیں، جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ ﷺ دشمن کی نقل

وحرکت سے باخبر رہنے کے لیے کس قدر حساس اور مستعد تھے۔اس سے دشمن کی طاقت اور کمزوری کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے اور اپنی تیاریوں میں بہتری لانے اور چال چلنے کا بھی بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔

دشمن کی جمعیت کو منتشر کرنا :

بہترین سپہ سالار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ خونریزی کے بجائے اپنی جنگی حکمتِ عملی کے استحکام کی بدولت میدان جیت لے۔یہ خوبی نبی کریم ﷺ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔غزوۂ خندق میں چونکہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد دَس گنا کم تھی اور اشیاء خورونوش اور جنگی آلات کی بھی کمی تھی،اس لیے نبی کریم ﷺ نے بہترین حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ایک طرف خندق جیسی نئی دفاعی صورت متعارف کروائی تو دوسری طرف کافروں کے اتحاد واتفاق کو ختم کرکے اُن میں باہمی بدگمانی اور انتشار پیدا کیا،جس سے ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ذیل میں کتب سیرت سے پورا واقعہ پیش خدمت ہے:

بہترین جنگی چال اور پروپیگنڈے کا استعمال:

آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جنگ ایک مرتبہ کی چال ہے۔(سنن ابی داؤد)

اگر یہی چال بروقت چل جائے تو جنگ کا پھانسہ ہی پلٹ جائے گا۔غزوۂ احزاب میں تیس ہزار سے زائد دشمنوں کی یلغار اور مسلمانوں کی بے سروسامانی اور قحط سالی نے مسلمانوں کو گھمبیر صورت حال سے دوچار کردیا تھا۔قرآن کریم نے اس کی تعبیریوں کی ہے:

﴿ إِذْ جَاءُوكُم مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴾(الاحزاب:10،11)

ترجمہ: جبکہ دشمن تمہارے پاس اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں (حیرت ودہشت سے باہر نکل آئیں) اور کلیجے منہ کو آگئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔یہاں مؤمن آزمائے گئے اور پوری طرح جھنجھوڑ دیے گئے۔

اس حالت میں رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں بھی قضا ہوئیں۔اسی موقع پر آپ ﷺ نے ان کے حق میں بددُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیٹ اور ان کی قبروں میں آگ بھردے،ان کی وجہ سے ہماری نمازیں قضا ہوئیں۔

اس موقع پر نعیم بن مسعود اشجعیؓ ایمان لائے اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میرے مسلمان ہونے کا علم کسی کو نہیں، لہذا آپ مجھے حکم فرمائیں کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر قریش اور یہودیوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی چال بنائی اور فرمایا کہ جنگ چونکہ بہترین تدبیر اور چال کا نام ہے، اس لیے تم ہماری طرف سے یہ کام سرانجام دو۔ چنانچہ وہ بنو قریظہ کے یہودیوں کے پاس آ گیا اور اپنی پرانی دوستی اور تعلق کا واسطہ دے کر کہنے لگا: میرے دوستو! تمہارا معاملہ قریش اور غطفان کی طرح نہیں، یہ شہر تمہارا ہی شہر ہے، یہاں تمہارے اموال اور تمہاری بیوی بچے ہیں، تم یہاں سے کہاں جاؤ گے؟ قریش اور غطفان اگر فتح یاب ہو گئے تو تم سے زیادہ ان کو نفع ملے گا، لیکن اگر شکست کھا گئے تو اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ اور تم یہ بات جانتے ہو کہ اگر محمد اور تمہاری لڑائی اکیلے میں لڑی گئی تو تم میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں، لہذا ان کے سرداروں میں سے کچھ سردار اپنے پاس رہن (گروی) رکھنے کا مطالبہ کرو۔ یہود اس بات سے کافی متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی بات تو سولہ آنے درست ہے۔

پھر نعیم بن مسعود قریش کے پاس آئے اور ابوسفیان اور دیگر سرداروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے: تمہارے ساتھ میری محبت اور محمد کے ساتھ نفرت سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ مجھے ایک اہم بات معلوم ہوئی ہے، جو تم لوگوں کے لیے نہایت اہم ہے، لہذا اس پر سوچ لیں اور میرا نام کسی کے سامنے ذکر نہ کریں۔ قریش نے حامی بھر لی۔ نعیم بن مسعودؓ فرمانے لگے: یہود بنی قریظہ تمہارے ساتھ اتحاد پر پشیمان ہیں اور انہوں نے محمد ﷺ کو پیغام بھیجا ہے کہ تمہارے ساتھ عہد شکنی کر کے ہم نے برا کیا، لہذا ہم اس کے بدلے قریش اور غطفان کے چند نامور سردار آپ کو دے دیں گے اور آپ ان کو قتل کر کے قریش کی طاقت کمزور کر دیں گے، پھر دونوں مل کر قریش پر حملہ کر کے ان کی بیخ کنی کر دیں گے۔ لہذا اے قریش والو! اگر یہود تم سے سردار طلب کریں تو بالکل نہ دینا۔ پھر یہی بات قبیلہ غطفان کے سرداروں کو بھی بتا دی۔

پھر ابوسفیان اور قبیلہ غطفان والوں نے بنی قریظہ کے پاس عکرمہ بن ابی جہل کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا کہ ہمارا کھانا پینا اور اونٹ وغیرہ کم ہو رہے ہیں، اگر تم چاہو تو آج رات سبھی مل کر مسلمانوں پر حملہ کر کے معاملہ ختم کر دیں۔ یہود نے کہا کہ ایک تو آج ہفتے کا دن ہے اور ہفتے کے دن شکار کرنے سے ہمیں جو نقصان ہوا تھا، اس کا آپ کو علم ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اپنے چند سردار ہمارے پاس رہن رکھ لیں۔ یہ بات سن کر قریش

اورغطفان کے لوگوں کونعیم بن مسعود کی بات کا یقین ہوگیا اور بنوقریظہ کودوٹوک جواب دیا کہ اگرآج رات ہمارے ساتھ لڑنا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ معاہدہ ختم۔ بنوقریظہ نے یہ بات سنی تو ان کو بھی نعیم بن مسعود کی بات کا یقین ہوگیا اوران کا اتحاد ختم ہوگیا، جس سے دونوں طرف بدگمانی اور بے اعتمادی کی فضا قائم ہوگئی۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ایک اور مدد بھی اس رات آ گئی اور سخت ترین طوفان نے قریش کے خیموں کوالٹ پلٹ کررکھ دیا اورابوسفیان نے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ واپسی کا حکم دیا۔(عیون الاثر:2/43، مغازی الواقدی، ذکرنعیم بن مسعود:1/481)

اس واقعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ کم ترین جانی نقصان کے ذریعے دشمن پر فتح پانے کی کوشش کی اوراللہ کے فضل سے ہمیشہ اس میں کامیابی پائی۔

امیروں اور کمانڈروں کے انتخاب میں احتیاط:

رسول اللہ ﷺ اپنے سپہ سالاروں اورامیروں کے انتخاب میں ان کی حربی مہارت، بہادری اور تجربے کالحاظ ضرور رکھتے تھے۔آپ ﷺ نے کسی صحابی کومحض اس وجہ سے کبھی امیر یاسپہ سالار نہیں بنایا کہ وہ صرف نیک اور عابدوزاہد ہے یا وہ فلاں قبیلے کا یا کوئی رشتہ دار ہے۔اس بارے میں حضرت ابوذرؓ کے مطالبہ ٔامارت اورآپ ﷺ کے طرزعمل سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کاواقعہ :

حضرت ابوذر رضی اللہ انتہائی عابدوزاہد صحابی تھے۔سابقین اولین صحابہ کرام میں سے تھے۔چوتھے یاپانچویں صحابی تھے جورسول اللہ ﷺ پرایمان لائے۔زہدوتقویٰ میں خاص مقام رکھتے تھے۔غزوۂ خندق کے بعد ہجرت کی اوررسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفروحضر میں رہنے کی وجہ سے کافی ساری احادیث کے راوی بھی ہیں۔رسول اللہ ﷺ ان سے کافی محبت رکھتے تھےاور ہمیشہ اُن کے لیے وہی چیز پسند فرمائی جواُن کے لیے زیادہ مناسب ہوتی تھی۔

مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ابوذرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے بھی کوئی عہدہ دیجیے یعنی کوئی جرنیل بنادیجیے، تاکہ اللہ کے راستے میں قیادت کرنے کا بھی ثواب مل جائے۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرمایا:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ : قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَلَا تَسْتَعْمِلُنِي؟ قَالَ: فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلٰى مَنْكِبِي ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ وَإِنَّهَا يَوْمَ القِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ .... يَاأَباذَرٍّ ! إني أراكَ ضعيفا ، وإني أُحِبّ لكَ ما أُحبّ لِنفسي ، لا تأَمَّرَنّ علىٰ اثْنينِ ، ولا تَوَلّينَّ مالَ يتيمٍ . (صحيح مسلم ،باب كراهية الامارة بغير ضرورة)

اے ابوذر! تو کمزور ہے اور یہ افسری (امارت) ایک امانت ہے جو قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا باعث بن سکتی ہے۔۔۔۔۔اے ابوذر! بیشک میں تمہیں (امارت کے معاملے میں) کمزور سمجھتا ہوں۔ میں تمہارے لیے وہی (خیر) پسند کرتا ہوں جو خود اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔تم ہرگز امیر نہ بننا، چاہے دو آدمیوں کے اوپر کیوں نہ ہو اور تم کبھی بھی یتیم کے مال کا ولی اور وصی (ذمہ دار) نہ بننا۔

یہاں بات ایک خاص ذمہ داری کی ہے، ورنہ خود سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ دل کی پاکیزگی اور زبان کی صداقت میں اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔آپؓ سے متعلق نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

ما أقلّتِ الغبراءُ ، ولا أظلّتِ الخضراءُ ، من رجلٍ أصدق لَهجةً من أبي ذرّشبه عيسى ابن مريم.(سنن الترمذي ، سنن ابن ماجة)

سطح زمین کے اوپر اور نیلی آسمان کے نیچے کوئی آدمی ابوذر جتنا سچی زبان والا نہیں، (سچی زبان اور زہد میں) وہ عیسی بن مریم کے مشابہہ ہے۔

(جاری ہے۔۔۔۔۔)

﴿بیاناتِ جمعہ﴾

جشن آزادی اور ہماری ذمہ داری

مفتی غلام اللہ صاحب
امام وخطیب: جامع مسجد بلال کلفٹن کراچی

الحمد للّٰہ و کفی والسّلام علی من لانبی بعدہ، أما بعد ! فأعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. قال اللّٰہ تعالی: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ﴾ (الحج: ٤١)

ترجمہ: یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں اور برائی سے روکیں اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔

وقال في مقام آخر: ﴿وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمۡ وَاَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَرَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ﴾ (الانفال : ٢٦)

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، تمہیں لوگوں نے (تمہاری) سرزمین میں دبا کر رکھا ہوا تھا، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک کر لے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹھکانہ دیا اور اپنی مدد سے تمہیں مضبوط بنا دیا اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔

امابعد:

اللہ رب العزت کی حمد وثنا کے بعد جو آیتیں آپ حضرات کے سامنے تلاوت کیں، اللہ تعالی ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے کہ آج کا دن وہ دن ہے، جس میں اللہ تعالی نے ہمیں بہت بڑی

نعمت (آزادی) سے ہمکنار کیا۔۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا وطن عزیز اور اسلامی مملکت پاکستان وجود میں آیا۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کے حقوق کثرت سے تلف ہونے لگے۔تجارتی ،معاشرتی اور تعلیمی وسماجی عدل وانصاف میں مسلمانوں کونظرانداز کیا جانے لگااور اس کے نتیجے میں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جانے لگا اور مسلمانوں کے مذہبی افکار واعمال سے ان کو روکا گیا تو اس کے نتیجے میں برپا ہونے والی عظیم تحریک سے اسلامی ملک پاکستان وجود میں آیا۔

اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پاکستان کو وجود دینے میں سب سے بڑا کردار علماء دیوبند کا ہے،اس لیے کہ اس ملک کا تصور سب سے پہلے جس شخصیت نے پیش کیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے سرپرستِ اعلیٰ تھے،جن کا نام حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہے۔پھر اس ملک کو عمل میں لانے اور پاکستان کا جھنڈا لہرانے والی شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی ہے، جو تفسیر عثمانی اور کئی مایہ ناز کتبِ حدیث کے مصنف ہیں۔مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش کی سرزمین پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے والی شخصیت علامہ ظفر احمد عثمانیؒ ہیں، جو اعلاء السنن کے مصنف اور حضرت تھانویؒ کے بھانجے ہیں۔ان کے علاوہ مفتی محمد شفیعؒ،مولانا حسن عمر امرتسریؒ (جو حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے)اور مولانا ادریس کاندھلویؒ کا بھی بہت بڑا کردار تھا۔اسی طرح تقریر وتحریر کے میدان میں پاکستان کے لیے قربانی دینے والی شخصیت مولانا شمس الحق افغانی تھے۔

تو عرض یہ کررہا تھا کہ پاکستان کو وجود دینے میں سب سے بڑا کردار علماء دیوبند کا تھا۔آپ تاریخ اُٹھا کر پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا۔آج اگر جشنِ آزادی کے نام پر کوئی تقریب ہوتی ہے تو اس میں خرافات،موسیقی اور گانے باجے ہوتے ہیں،اس میں میراثی لوگ جمع کرلیے جاتے ہیں،ان تقاریب میں آپ کو علماء کرام کا نام ونشان تک نظر نہیں آئے گا۔کبھی آپ نے علامہ تھانویؒ کا نام سنا ہے؟ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ،مولانا ادریس کاندھلویؒ،مولانا شمس الحق افغانیؒ کا نام سنا ہے؟ اور ان کے علاوہ وہ بے شمار علماء کرام،جنہوں نے اس وطن کو وجود دینے کے لیے قربانیاں دیں،ان کا نام سنا ہے؟ اور آج جو سیکولر اور لبرل طبقے والے لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان کو وجود دینے میں علما کا کوئی کردار نہیں ہے۔ان کو کلمہ تک نہیں آتا،ان کو نماز تک نہیں آتی، دین سے دور کا بھی تعلق نہیں اور علما پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان سے علما کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

تو عرض کر رہا تھا آج کا دن آزادی کا دن ہے اور جب اللہ تعالی کسی کو غلامی سے آزادی اور خلاصی عطا فرماتے ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرنا چاہیے، بجائے اس کے کہ ہم رات کو شراب نوشی کریں اور باجے بجائیں۔ یہ ملک جس مقصد اور جس نعرے (پاکستان کا مطلب کیا ۔۔۔لا الٰہ الا اللہ) کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا، اس مقصد پر نظر رکھ کر اس کے تقاضوں کو پورا کریں۔ نیز جسمانی طور پر تو ہمیں آزادی مل گئی، لیکن قانونی، معاشی اور سماجی طور پر ابھی تک ہم آزاد نہیں۔

تو جشن کی صورت یہ ہونی چاہیے کہ ہم اللہ کا شکر ادا کریں اور اس کے لیے مختلف طریقے ہیں: شکر قولی بھی ہے اور شکر فعلی بھی ہے۔ فعلی یہ ہے کہ نفل نماز پڑھیں، نفلی روزہ یا نفلی صدقہ دیں۔ اور قولی یہ ہے کہ زبان سے الحمدللہ پڑھیں، کوئی ایسا عمل نہ کریں جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔

واقعہ :

آپ کو معلوم ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کے غلام تھے اور اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے خلاصی عطا فرمائی تو بنی اسرائیل آزاد ہو گئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ﴾(البقرة:٤٩)

ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی جو تمہیں بڑا عذاب دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس ساری صورت حال میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔

تو بطورِ نعمت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ دیکھو ہم نے تمہیں غلامی جیسے عذاب سے نجات دی، لہذا تم اس کا شکر ادا کرو۔

نیز جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی دس محرم کا روزہ رکھتے تھے تو آپ ﷺ نے وجہ پوچھی، تو انہوں نے کہا کہ اس دن ہم روزہ اس لیے رکھتے ہیں کہ اللہ نے اس دن ہمیں غلامی سے نجات عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی علیہ السلام اور اس کی قوم کو نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا۔ تو اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ہم اس دن روزہ رکھتے ہیں، تو ہمارا جشن یہ ہے کہ ہم روزہ

رکھتے ہیں۔تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہم تو موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہیں، لہذا آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا۔(سنن ابی داؤد)

حدیث سے معلوم ہوا کہ جس دن اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو غلامی سے نجات دی، اُسی دن شکرانے کے طور پر حضرت موسیٰؑ اور اس کی قوم روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے بھی موسیٰؑ کی موافقت میں روزہ رکھنے کا حکم دیا۔نیز حضرت اُم ہانی (حضرت علیؓ کی بہن) سے روایت ہے کہ جب سن آٹھ ہجری میں مکہ فتح ہوئی تو آپ ﷺ نے شکرانے کے طور پر چاشت کی نماز دو رکعت کی بجائے آٹھ رکعات پڑھی۔(سنن الترمذی)

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب اللہ نے آزادی دی تو جشن کی صورت یہ نہیں کہ ہم بے ہودگیوں اور بے حیائی کا ارتکاب کریں۔گانے بجانے کی محافل سجائیں، شکر ادا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کے مطابق آزادی کا جشن منانا چاہیے۔

اسلامی ملک سے محبت ایمان کا حصہ ہے اور ہونا بھی چاہیے۔اور فطرت بھی یہی ہے کہ جو جس زمین پر رہتا ہے، اُسے اُس زمین کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے موقع پر مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے اس کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

" ما أطيبكِ من بلدٍ وأحبك إلي ولولا أن قومي أخرجوني منك ما سكنت غيرك.(رواه الترمذي)

آپ کتنا پاکیزہ شہر ہیں اور مجھے آپ سے بہت زیادہ محبت ہے، اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں آپ کے علاوہ کسی اور جگہ رہائش پذیر نہ ہوتا۔

تو یہ آپ ﷺ کی محبت تھی مکہ مکرمہ کے ساتھ۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اپنے ملک سے محبت کرنا اور آزادی کے دن خوشی کا اظہار کرنا، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا؛ یہ بہت اچھی بات ہے۔لیکن خوشی منانے کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے موقع پر شراب نوشی اور گانے بجانے کی محفلیں سجائی جائیں۔حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

" صوتان ملعونان في الدنيا والآخرة : مزمار عند نعمة ورنّة عند مصيبة .

(الترغيب والترهيب)

دوقسم کی آوازیں ملعون ہیں: ایک خوشی اورنعمت کے وقت گانے بجانے اورطبلہ وغیرہ کی آواز اوردوسری قسم مصیبت کے وقت رونے کی آواز۔تو خوشی کے موقع پر گانے بجانے کی آواز ملعون ہے۔اسی طرح وہ شخص بھی ملعون ہے، جواس کو بجاتا ہے اوروہ شخص بھی ملعون ہے، جواس مجلس میں بیٹھتا ہے۔نیز حدیث میں آتا ہے کہ:

" الغناء ينبت النفاق في القلب ".(شعب الايمان للبيهقي)

کہ گانا دل میں نفاق کو اُگاتا ہے،جس سے دل روحانی طور پر کمزور ہوجاتا ہے۔تو جولوگ گانے باجے سنتے رہتے ہیں،ان کے دل سے نیکی کی صلاحیت سلب کرلی جاتی ہے اوراس میں حق بات قبول کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی۔

دوسری وہ آواز جومصیبت کے وقت نکلتی ہے۔مثلاً بلندآواز سے رونا،نوحہ کرنا، ماتم کرنا وغیرہ،البتہ مصیبت کے وقت بلااختیار آنکھوں میں جوآنسوآجائیں تو یہ ملعون نہیں،جیسا کہ آپ ﷺ کے بیٹے ابراہیمؓ کی وفات پرآپ ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو نکلے اورفرمایا کہ دل روتا ہے تو وہ الگ چیز ہے۔

لہذا چودہ اگست کے موقع پر مسلمانوں کو چاہیے کہ خوشی منائیں،لیکن طریقہ وہی اختیار کریں جو آپ ﷺ نے اختیار کیا کہ آپ نفل پڑھیں،روزہ رکھیں اوراللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں اور جورائج الوقت خرافات ہیں،ان سے مکمل اجتناب ضروری اورلازمی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کواس پرعمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

فوائدولطائف

چھوٹا اگرچہ مرتبہ میں بڑا ہو،مگر بڑی عمر والے کے لیے جائز ہے کہ مخاطبت میں اپنے سے کم عمر والے کے لیے وہی الفاظ استعمال کرے جواصاغر کے لیے کیے جاتے ہیں،جیسا کہ ورقہ بن نوفل نے پہلی وحی کے نازل ہوتے وقت باوجود آپ کو نبی اوررسول ماننے کے آپ ﷺ کو یاابن اخی (اے میرے بھتیجے!) کہہ کرخطاب کیا۔(بحوالہ سیرت مصطفیٰ،جلداول،ازمولانا محمد ادریس کاندہلوی)

﴿بیاناتِ جمعہ﴾

شانِ سیدنا عمر فاروقؓ

مفتی غلام اللہ صاحب
امام وخطیب: جامع مسجد بلال کلفٹن کراچی

نحمدہٗ ونصلّي علیٰ رسوله الكريم. أمّا بعد ! فأعوذ باللّٰه من الشيطٰن الرجيم، بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم. قال اللّٰه تعالیٰ : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴿٥٩﴾﴾(الاحزاب)

وقال النبیﷺ : إن الله وضع الحق على لسان عمر يقول به.(أبوداؤد)

وقال النبیﷺ : لو كان بعدي نبي لكان عمر.(سنن الترمذي)

أمابعد!

آج یکم محرم الحرام کا دن ہے۔ یکم محرم الحرام کو حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اسی طرح حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ بھی اسی مہینے یعنی دس محرم الحرام کو پیش آیا۔ دس محرم الحرام یعنی عاشورا کے دن روزہ رکھنے کی ترغیب بھی ہے۔

یکم محرم الحرام سیدنا عمر فاروقؓ کی شہادت کا دن ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے بعد حضرت عمر فاروقؓ دوسرے خلیفہ بنے۔ ان کی فضیلت سے متعلق کافی ساری احادیث اور بے شمار واقعات ہیں۔ 22 لاکھ مربع میل پر ان کی سلطنت تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اگر حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت دس سال اور رہتی تو پوری دنیا میں ان کی حکمرانی ہوتی۔

فضائل:

ان کے فضائل کے حوالے سے امام مسلمؒ ''صحیح مسلم'' میں ایک حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں

کہ تم سے پہلی اُمتوں میں سے ہر اُمت میں "مُحَدَّث" لوگ ہوتے، اگر میری اُمت میں سے کوئی اُن کی طرح محدّث ہوتا تو بیشک عمر بن خطاب اُن محدّثین کی جماعت میں ہوتا۔ (صحیح مسلم، باب فضائل عمرؓ)

پھر امام مسلمؒ نے ابن وہب سے محدّث کی تفسیر یوں نقل کی ہے: "مُحَدَّثُوْنَ مُلْهَمُوْنَ" یعنی محدّثون سے مراد مُلہمون ہے۔ مُلہَم اُس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اچھی بات القاء فرماتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں حضرت عمر فاروقؓ ہے کہ اللہ ان کے دل میں اچھی اچھی باتیں ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے علماء نے ''موافقات عمر'' جمع کیے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق جو آیات نازل فرمائیں، علماء کرام نے ان پر کتابیں لکھی ہیں، موافقات عمرؓ کی تعداد اکیس تک پہنچتی ہے۔

امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں حدیث نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"وافقت ربي في ثلاث". (من فضائل عمر)

کہ میں نے اپنے رب کی رائے کی (بروقت) موافقت کی۔ یعنی جو رائے میری تھی، اسی کے موافق اللہ نے حکم نازل فرمایا تین جگہ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے مقامات ہیں۔

(۱) ایک تو میں نے یہ رائے دی تھی کہ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بنائی جائے تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی:

﴿واتخذوا من مقام ابراهيم مصلىٰ﴾ (البقرة:۱۲۵)

(۲) میری رائے یہ تھی کہ عورتیں پردہ کریں، اپنے گھروں میں رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (الاحزاب:۵۹)

(۳) جب آپ ﷺ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کا جنازہ پڑھانے لگے تو حضرت عمر فاروقؓ نے منع کیا کہ آپ ﷺ جنازہ نہ پڑھائیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس پر آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ (التوبة:۸٤)

(۴) غزوۂ بدر میں جو ستر لوگ قید ہو کر آئے، ان کے بارے میں جب مشورہ ہونے لگا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے یہ تھی کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے، حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ نہیں، ہر ایک اپنے رشتہ

دار کو قتل کرے، لیکن فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾(الانفال:٦٧)

تو موافقات عمرؓ پر اگر بات کی جائے تو بات طویل ہو جائے گی۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے بے شمار فضائل ہیں اور اس سے بڑی فضیلت کیا ہو سکتی ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا:

"لو كان بعدي نبي لكان عمر". (سنن الترمذی)

ترجمہ: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

بس اس سے آگے اور کوئی بات نہیں ہو سکتی، کیونکہ اگر کوئی اس سے آگے بھی بات کرتا ہے تو اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَشدآء على الكفار﴾(الفتح:٢٩)

ترجمہ: کہ کفار کے مقابلے میں انتہائی سخت ہیں۔

واقعہ :

تفسیر کبیر" میں اس آیت ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾(النساء:٦٠) کے تحت امام رازی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک یہودی اور ایک منافق (جو بظاہر مسلمان تھا) کے درمیان تنازعہ ہوا تو منافق چاہ رہا تھا کہ اس تنازعہ کو کعب بن اشرف جو یہودیوں کا سردار تھا، کے پاس لے جایا جائے ۔۔۔۔۔ (کعب بن اشرف منافق اور بڑا گستاخ رسول تھا، آپﷺ کی شان میں بڑی گستاخیاں کرتا تھا اور صحابہ کرام کی جو عورتیں تھیں، ان کی تشہیر کرتا تھا۔ یعنی ان کے محاسن اور اوصاف اپنے اشعار میں ذکر کرتا تھا اور مسلمانوں کو اور آپﷺ کو سخت تکلیفیں دیتا تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے " **كتاب المغازي ، باب قتل كعب بن اشرف** " میں واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ آپﷺ نے فرمایا: "**من لكعب بن اشرف**"؟ (کون ہے

جوکعب بن اشرف کوقتل کرے؟" **فانہ آذی اللہ ورسولہ**" (اس لیے کہ اس نے اللہ اوراس کے رسول کو تکلیف دی ہے)۔محمد بن مسلمہ کھڑے ہوئے اور کعب بن اشرف کے پاس جا کر اس کو واصل جہنم کر دیا)۔۔۔ تو وہ منافق چاہ رہا تھا کہ کعب بن اشرف فیصلہ کرے اور یہودی تو اہل کتاب تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ آپ ﷺ فیصلہ کرے۔ چنانچہ وہ دونوں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کیا۔تو منافق نے کہا: چلو حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں، ان سے بھی فیصلہ کروالیتے ہیں تو حضرت عمرؓ کے پاس جب آئے اور عمر فاروقؓ نے واقعہ سنا، تو یہودی نے کہا کہ یہ فیصلہ پہلے آپ ﷺ میرے حق میں کر چکے ہیں، لیکن یہ آدمی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں، اس وجہ سے ہم یہاں آگئے۔حضرت عمرؓ نے کہا: آپ ٹھہرو، میں گھر سے ہو کر آتا ہوں، اندر گئے، تلوار لے کر واپس آئے اور اس منافق کی گردن اڑا دی اور فرمایا: جو آپ ﷺ کا فیصلہ نہیں مانتا، اس کے لیے عمر کا یہی فیصلہ ہے۔تو امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام یہ دیکھ کر آئے اور فرمایا کہ یہ فاروق ہے:"**فرق بین الحق والباطل**" (انہوں نے حق اور باطل کے درمیان فرق کیا)۔تو اللہ کے نبی نے فرمایا:"**أنت الفاروق**" کہ آپ عادل ہیں، آپ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کیا۔(قرطبی، رازی)

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ منافق کی سوچ یہ تھی کہ میں بظاہر مسلمان ہوں اور یہ یہودی ہے، ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ میرے حق میں فیصلہ کر دے، لیکن معاملہ اُلٹا ہوگیا۔اور حضرت عمرؓ اس آیت ﴿**اشداء علی الکفار**﴾ کے مصداق ثابت ہوئے۔

تو حضرت عمر فاروقؓ کی بے شمار فضیلتیں ہیں۔حدیث میں آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مرتبہ میں سو رہا تھا، لوگ میرے سامنے پیش کیے گئے تو میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کی قمیص سینے تک آرہی تھی، کسی کی گھٹنوں تک اور کسی کی پیٹ تک۔حضرت عمر فاروقؓ کو دیکھا تو وہ اپنی قمیص کو گھسیٹ کر چل رہے تھے۔صحابہ نے پوچھا کہ اس کی تعبیر آپ ﷺ نے کیا نکالی؟ فرمایا:''دین کے حوالے سے بڑے مضبوط ہوں گے''۔(صحیح بخاری، کتاب التعبیر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خواب میں میرے سامنے دودھ پیش کیا گیا، تو میں نے دودھ پیا، اتنا دودھ پیا کہ میرے ناخنوں سے وہ دودھ نکلنے لگا، یعنی میں سیراب ہوگیا اور

جو دودھ بچ گیا، وہ میں نے حضرت عمرؓ کو دیا، حضرت عمر نے وہ دودھ پیا۔ تو صحابہ نے پوچھا کہ کیا تعبیر ہے؟ فرمایا: علم۔ (بخاری شریف، کتاب العلم)

تو جو خواب میں دودھ دیکھے یا دودھ پی رہا ہو تو گویا اللہ تعالیٰ اسے یا اس کی نسل میں اس کے بچوں کو علم عطا فرمائیں گے۔ ایک حدیث میں آتا ہے:

"إن الله جعل العلم على لسان عمر وقلبه". (سنن أبي داؤد)

اللہ تعالیٰ نے حق کو حضرت عمرؓ کی زبان اور دل پر جاری کر دیا۔

''الاشباہ والنظائر'' میں لکھا ہے کہ جو شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا منکر ہو تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ سارے کے سارے خلفاء برحق ہیں۔ امام نوویؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

ویسے تو "**الصحابة كلهم عدول**" (صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں) لیکن عمل کے اعتبار سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا لقب ''صدیق'' ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف صدیق وہ ہے، باقی صحابہ صدیق نہیں، بلکہ وہ بھی ہیں، لیکن یہ ان کا اپنا مقام ہے۔ حضرت فاروق اعظم عادل تھے، باقی بھی عادل تھے، ظالم نہیں تھے، لیکن ان کا ایک مقام اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا تھا۔

فتح بیت المقدس کے وقت حضرت عمرؓ کی حالت:

بیت المقدس کو فتح کرنے والے حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ کہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ امیر لشکر تھے، آپ نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا۔ لیکن محاصرہ کر لینے کے باوجود بیت المقدس فتح نہیں ہوا۔ بالآخر یہودیوں کے جو مذہبی پیشوا تھے، انہوں نے کہا کہ ہماری کتابوں میں لکھا کہ اس مقام کو ایک بادشاہ فتح کرلے گا، جس کی فلاں فلاں صفات ہوں گی تو حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے فرمایا: ہم کامیاب ہو گئے، اس لیے کہ یہ صفات ہمارے بادشاہ میں موجود ہیں۔ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھ کر بلایا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ بذات خود معاہدہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ تشریف لانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

حضرت عمرؓ جب شام کی طرف روانہ ہوئے تو نہ ٹھاٹ کا سامان تھا نہ رعب داب کی کوئی تدبیر کی گئی تھی، بلکہ اس وقت امیر المؤمنین کے پاس ایک ہی اونٹ تھا اور سوار ہونے والے ایک آپ تھے اور ایک غلام تھا۔ دونوں کے درمیان یہ بات طے ہوئی کہ اس پر ایک میل مثلاً خود سوار ہوں اور ایک میل غلام سوار ہو۔

.....جب شہر کے قریب پہنچے تو لوگوں نے عرض کیا کہ اس وقت مناسب یہ ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو جایئے، آپؓ نے ان کے اصرار سے منظور کرلیا اور گھوڑے پر چڑھے، مگر فوراً ہی اتر پڑے اور فرمایا کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور فرمایا:

"نحن اقوام أعزنا الله بالاسلام".

یعنی ہم کو حق تعالیٰ نے اسلام سے عزت دی ہے، بس یہی کافی ہے، اس کے سوا کسی طریقہ عزت کی ہم کو ضرورت نہیں اور اسی طرح آپ پیوند زدہ لباس میں اونٹنی پر سوار ہو کر چل دیے۔ نیز عجیب بات یہ کہ اس وقت باری غلام کی سواری کی تھی، اس نے عرض کیا کہ حضرت اب موقع آپ کے پیدل چلنے کا نہیں ہے، شہر آ گیا ہے آپ سوار ہو لیں۔ فرمایا: میں ظلم کروں، یہ تو حق تلفی ہے۔ غلام نے کہا کہ میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، مگر آپ نے منظور نہیں کیا اور اسی طرح سے چلے کہ غلام اونٹ پر اور خلیفہ اس کی مہار پکڑے ہوئے تھے، جب دروازے کے پاس پہنچے تو علمائے اہل کتاب نے سوار کو خلیفہ سمجھا اور اس کا حلیہ کتاب سے ملایا، جب حلیہ نہ ملا تو پوچھا کیا خلیفہ پیچھے آ رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں خلیفہ یہ ہیں جو مہار پکڑے ہوئے ہیں، ان سے حلیہ ملایا تو مل گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ کتاب میں یہ بھی تھا کہ خلیفہ جس وقت بیت المقدس پر آئیں گے تو ہیئت یہ ہوگی کہ غلام سوار ہوگا اور خلیفہ اونٹ کی مہار پکڑے ہوں گے۔ بس لوگوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور بدوں لڑائی کے مسلمانوں کی فتح ہوگئی۔ سادہ زندگی نے وہ کام کر دیا جو بڑے بڑے لشکر بھی نہ کر سکے۔ (خطباتِ حکیم الامت: ۲۶/۳۴۱)

شہادت:

۲۷ ذی الحج، 24 ہجری کو جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز فجر ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے تو ابولؤلؤ فیروز ملعون (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے غلام) نے حضرت عمر فاروقؓ پر پیچھے سے حملہ کیا اور باقی ماندہ نماز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوری کی۔ یکم محرم الحرام کو آپؓ اس دنیا سے وصال فرما گئے۔

تو آج حضرت فاروقِ اعظمؓ کی شہادت کا دن ہے۔ 27 ذی الحج کو ان پر حملہ ہوا اور یکم محرم الحرام جو اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے، کو انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

﴿دارالافتاء﴾

دارالافتاء

مفتی حمیداللہ جان

0333-9133008

اپنے مسائل کا پتہ پوچھنے کے لیے آپ ماہنامہ ندائے حسن کے ڈاک پتے یا ای میل پر سوال بھیج سکتے ہیں۔
سوال پوچھنے میں یہ خیال رکھیں کہ وہ مفید اور قابلِ اشاعت ہونے کے ساتھ ساتھ مسلکی طور پر اختلافی نہ ہو۔

لقطے کا حکم

سوال:

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ راستے میں پڑے ہوئے پیسے اُٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر اُٹھا لیے تو کیا کیا جائے؟ نیز اس کے کچھ احکام بھی بتا دیں؟

الجواب وباللہ التوفیق:

واضح رہے کہ جو چیز راستے میں گری پڑی مل جائے (چاہے قیمتی ہو یا غیر قیمتی ہو) اسے لقطہ کہا جاتا ہے، اس کے اٹھانے کی کئی صورتیں ہیں:

1: اگر ضائع ہونے سے بچا کر مالک تک پہنچانے کے ارادے سے اٹھایا جائے تو یہ اٹھانا مستحب ہے۔

2: اگر ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور مالک تک پہنچانے کے ارادے سے اٹھایا جائے تو یہ اٹھانا مباح ہے۔

3: اگر اپنے لیے اٹھائی جائے تو یہ اٹھانا حرام ہے۔

4: اگر ضائع ہونے کا یقین ہو تو اٹھانا واجب ہے۔

اٹھانے کے بعد اس کا حکم یہ ہے کہ حتی الوسع اس کی تشہیر و اعلان کیا جائے تا کہ مالک تک پہنچ جائے اور جب مالک کے ملنے سے ناامیدی ہو جائے یا وہ ایسی چیز ہو جو خراب ہوتی ہو تو پھر اگر چاہے تو مالک کی نیت

سے صدقہ کرسکتا ہے، البتہ اگر مالک آجائے اور وہ تاوان لینا چاہے تو اس کو اختیار ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جس کو کسی راستے میں پیسے مل جائے اور اسے یہ یقین ہوجائے کہ اگر میں یہ پیسے نہ اٹھاؤں تو کوئی اور اٹھا کر لے گا تو پھر اس پر لازم ہے کہ یہ پیسے اٹھائے اور اس کی خوب تشہیر کرے اور جب اس کا غالب گمان ہوجائے کہ اس کا مالک اب نہیں آئے گا تو یہ فقراء پر صدقہ کرے اور اگر خود فقیر ہو تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے، لیکن اگر مالک آجائے اور اس کا مطالبہ کرے تو دونوں صورتوں میں یہ ضمان دے گا۔

والدليل على ذلك:

أما قبل الأخذ فلها أحوال مختلفة قديكون مندوب الأخذ وقديكون مباح الأخذ وقديكون حرام الأخذ أما حالة الندب فهو أن يخاف عليها الضيعة لو تركها فاخذها لصاحبها أفضل من تركها--وأماحالة الإباحة فهو أن لا يخاف عليها الضيعة فيأخذها لصاحبها--وأما حالة الحرمة فهو أن يأخذ ها لنفسه لا لصاحبها.(بدائع الصنائع، كتاب اللقطه **5/295**،وحيديه)

وعرف إلى أن علم أن صاحبها لا يطلبها أو أنها تفسد إن بقيت كالأطعمة والثمار---فينتفع الرافع بها لوفقيرا وإلاتصدق بها على فقير--فان جاء مالكهابعد التصدق خير بين إجازة فعل هولوبعد هلاكها وله ثوابها أو تضمينه.

(الدرمع التنوير، كتاب اللقطه **428---6/424**،رحمانيه)

قوله إلى أن علم أن صاحبها لايطلبها لم يجعل للتعريف مدة اتباعا للسرخسى فإنه بنى الحكم على غالب الرأى فيعرف القليل والكثير إلى أن يغلب على رأيه أن صاحبه لا يطلبه وصححه فى الهداية وفى المضمرات والجوهرة وعليه الفتوى(حوالابالا،ص **425**)

2023\Ishtihar Page 56.jpg not found.